بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

اسلام سے منسلک دہشت گردی کا مغرب کی طرف سے واویلا

ہمارے اس آج کے دور میں مغرب کی طرف سے اسلام کو دہشت سے منسلک کرنے کی سازش نے فکرِ قرآنی کے حاملین کے لئے بھی بے چینی پیدا کر دی ہے۔ مغرب کے طاقتور میڈیا نے اس تاثر کو پھیلانے میں اپنے پورے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں کہ اسلامی اقدار ایک مہذب معاشرہ کے قیام میں باعثِ رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں دیکھا جا رہا ہے کہ جو چیز واضح طور پر مغرب کے اس تاثر کو ہوا دے رہی ہے، وہ بدقسمتی سے حالیہ عالمی دہشت کی کاروائیوں میں مسلمانوں کا ملوث ہونا ہے۔ اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا جا رہا ہے کہ متعلقہ مسلم ممالک کی حکومتیں ان دہشت گردی میں ملوث لوگوں سے لاتعلقی کا اظہار کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہو رہیں۔ ان ممالک کی تائید میں دبے لفظوں میں خود مغرب کے ممالک بھی ان دہشتی کاروائیوں کو اسلام کی تعلیم کے منافی ہونے کا بیان دے کر اپنی سیاسی وابستگی کا تصور سامنے لاتے رہتے ہیں۔

ان کے رویوں سے سامنے آ رہا ہے کہ وہ یہ بیانات سیاسی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دہشت گردی کا یہ مسئلہ سیاسی نوعیت اختیار کر چکا ہے، جس کا حل علم کی کسوٹی کی بجائے طاقت پر انحصار کرنے میں رکھا جا رہا ہے۔

میری اپنی ذاتی رائے میں اگر دہشت گردی کا مسئلہ سیاسی زعماء کی جگہ حکمائے مغرب کے سامنے پیش ہوتا تو وہ اسے عقلی اور منطقی انداز فکر لئے حقیقی حل ڈھونڈنے میں کامیابی کے قریب پہنچ سکتے تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اسے سیاست کے تناظر میں نسلی مفادات لئے ہوئے ان کی زبان کے مطابق ایک سیاسی ایجنڈا کی شکل دی جا رہی ہے۔

ظاہر ہے قرآن اس روش سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے اور وہ مسائل کا حل میں عقل وفکر اور دلیل و برہان کی طرف دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا میری کوشش یہی ہے کہ میں ان کالموں میں دلائل و برہان سے خصوصاً حکمائے مغرب کے سامنے قرآن کے ان بنیادی اصولوں کا مختصراً جائزہ پیش کروں جو وہ معاشرہ کی تشکیل میں بطور ہدایات سامنے لاتا ہے۔

آج ہمارے اس دور میں دہشت گردی کا مسئلہ صرف Law and Order کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس سے بڑھ کر خیر وشر کا معیار بن کر معاشرتی مسئلہ بن چکا ہے۔ دیکھا جائے تو اسے آج کے دور کا مسئلہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے' فکر انسان کے سامنے یہ خیر وشر کی نسبت سے ہمیشہ حل طلب رہا ہے۔ ہم سب اپنی روزمرہ زندگی میں اسپر بحث میں مصروف رہتے ہیں لیکن ابھی تک اسے حل تو کجا' فکر انسانی اسے Define بھی نہیں کر سکی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہوسکی ہے اور اس روش کو تقلید' کا نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن علم کا نہیں۔ اس روش کو علمی انداز دینے میں مشہور مفکر وائٹ ہیڈ کا مقولہ مشہور ہے کہ:

(It requires really great mind to undertake the anaylises of what is obvious)

یعنی جو باتیں بدیہی طور پر صاف اور واضح نظر آتی ہیں' ان کا جائزہ لینا اور تجزیہ کرنا ہر ایک کا کام نہیں (سیاست دانوں کا تو بالکل ہی نہیں) اس کے لئے فی الحقیقت بڑے دل اور دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے لئے لازمی ہے کہ نوع انسانی وطن (اقبال کی نظر میں تازہ خدا) کی نسلی تعصّبات سے نکل کر پوری نوع انسانی کا مفاد لئے ہوئے ایک امت کی تشکیل دینے کی طرف توجہ مبذول کرے۔ یہ امر تسلی بخش ہے کہ حکمائے مغرب بھی خود اپنی فکر سے اس خیال تک پہنچ کر ابھی تک پوری نوع انسانی کے لئے ایک قانون کی تلاش میں ہے' جسے نافذ کرنا' ممکن العمل ہو۔

اس ضمن میں یہاں میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ سے درج ذیل سفارش کو قارئین کے سامنے لانا چاہوں گا۔

خیر و شر کا سلسلہ اصل میں معاشرتی مسئلہ ہے' جہاں انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔ جس میں کون سی صورت پیدا کی جائے' جس میں ان کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور وہ امن و اطمینان بلا خوف و حزن زندگی بسر کر سکیں۔ حکمائے مغرب عقل کے ذریعے پوری نوع انسانی کے ایک امت کے خیال تک پہنچ کر ساری دنیا کے لیے ایک قانون کے نافذ کرنے کی اہمیت سے بخوبی واقف تو ہو گئے' لیکن وہ ملے گا کہاں سے؟ اس کے لیے ہنوز تلاش جاری ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسانی فکر کو حکمائے مغرب کے اس عقلی تجرباتی طریق پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ تباہیوں اور بربادیوں کا نوع انسانی کو سامنا کراتا رہے یا اس کے علاوہ اور طریق کار بھی ہے جس سے انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کی ہدایات کی روشنی میں ہی انسانی فکر کو وہ رہنمائی ملتی ہے جو اسے صحیح وسالم منزل مقصود تک لے جا سکتی ہے۔ لہٰذا نوع انسانی میں یہ احساس

بیدار کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ:

1- وہ اس ضرورت کو محسوس کریں کہ وہ اپنے آپ کو حیوان سے ارتقا یافتہ آخری مخلوق تک محدود نہ رکھیں بلکہ وہ یہ شعور اجاگر کریں کہ وہ ارادہ عقل فعال کی قوت رکھتے ہیں اور ان کے آزادانہ انتخاب کی صلاحیت کی بنا پر فیصلے کرنے کی بھی آزادی رکھتے ہیں۔ انہی صفات کی بنا پر جو تخلیقی اعمال بجالاتے ہیں وہ ان کی اپنی ذات کا حصہ ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ذات کوئی زمان و مکان میں محدود محسوس شے نہیں بلکہ انہی تخلیقی اعمال کی صلاحیت ہی کو ذات کا نام دیا جاتا ہے جو خدا کی اپنی الٰہیاتی توانائی کے ذریعے انسان کو مضمر حالت میں دی گئی ہے۔ اب انسان کا یہ فریضہ ہے کہ اس صلاحیت کو مشہود اور بارآور کرتے ہوئے اس کو استحکام اور توازن بخشتے ہوئے ارتقائی مراحل طے کرے۔

ان توازن بدوش ذرائع کا علم جنہیں قران کی زبان میں مستقل اقدار خیر کا نام دیا جاتا ہے' حکمائے مغرب نے علم استدلالی اور غیر استدلالی طریق سے دریافت کرنے میں پوری دلجمعی سے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن باوجود ترقی علم کے ابھی تک اس کی حقیقت کا ادراک حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

2- ایسی جگہ جو قوم بھی اپنے آپ کو وارث قران کا حق دار سمجھتی ہے' اس کا فریضہ ہے کہ وہ نوع انسانی کی اس مشکل کا حل پیش کرتے ہوئے واضح کرے کہ تنہا عقل انسانی خیر و شر کی حقیقت کا ادراک اور حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی رہنمائی کے لیے اس طرح وحی کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں میں دہرانا چاہوں گا کہ دہشت گردی کی بنیاد استحصالی بے انصافی ہے اور اس کے لئے وطن پر مبنی نسلی مفاد یا برتری کی دلیل رکھنا دہشت گردی کی تقویت کا باعث بن رہا ہے۔ اس کے برعکس قرآن پوری نوع انسانی کے مفاد پر حامل ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل دینے کی ہدایت کرتا ہے' جس میں فرد کی ذات کی نشوونما لینے (جو استحصال کا باعث بنتا ہے) سے نہیں بلکہ دینے (Contribution) سے ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے لئے یہ نظریہ نیا ہو' ان کے لئے اور بالخصوص ان کے لئے جو اس مسئلہ کے حل اور حقیقت کی تلاش میں ہو' ان کے لئے اس نظریہ کے حق میں قرآن کی درجِ ذیل آیات کے حوالے سامنے لائے جا رہے ہیں۔

نوع انسانی کا امت واحد کا قرآنی تصور

قرآن نوع انسانی کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ:

الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ
(النساء 4:1)

ہم نے تم سب کو نفس واحد (ایک Life cell) سے پیدا کیا ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ تمام انسانوں کی پیدائش ''نفس

واحدہ'' سے ہوئی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل (Origion) کے اعتبار سے تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔لہٰذا تمام نوع انسان کا ایک عالمگیر برادری اور ایک قوم کی حیثیت سے رہنا مقصد حیات ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا. (یونس10:19)

نوع انسان امت واحدہ (ایک قوم) تھی۔اس کے بعد انھوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیے۔

قوموں اور گروہوں میں دیے ہوئے انسانوں کو ایک امت (عالمگیر برادری) بنانے کا طریق یہ ہے کہ ان سب کے لیے ایک ضابطہ قوانین ہو۔قرآن نے اپنے آپ کو تمام عالم انسانیت کے لیے مشترکہ قوانین کے حیثیت سے پیش کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ. (یونس10:59)

اے نوع انسانی یقیناً تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہارے پاس ایک ضابطہ قوانین آ گیا ہے۔

لہٰذا تمام نوع انسانی کا ایک ضابطہ حیات کے مطابق ایک امت بن کر رہنا قرآن کا مقصود ہے۔

''الناس'' میں اپنے اور پرائے' مومن و کافر سب شامل ہیں۔قرآن کریم اس لیے:

1- خدا کا تصور بطور ''رب العالمین یعنی پوری کائنات بشمول نوع انسانی کا پرورش کرنے والا'' دیتا ہے۔

2- اس کے رسول کا تصور بطور 'رحمۃ للعالمین یعنی پوری کائنات بشمول نوع انسانی کے لیے وجہ رحمت کا'' دیتا ہے۔اور

3- خود قرآن کا تصور بطور ''ذکر للعالمین یعنی پوری کائنات بشمول نوع انسانی کے لیے نصیحت کا'' دیتا ہے۔

اسی لیے اسلامی مملکت کی نفع بخشیاں تمام نوع انسانی کے لیے ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً (البقرہ2:29)

خدا وہ ہے جس نے وہ سب کا سب جو زمین میں ہے تم سب کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔

یعنی اس لیے پیدا کیا ہے کہ تم سب اس سے متمتع ہو۔اس لیے نہیں کہ چند افراد یا کوئی مخصوص گروہ ان پر قابض ہوکر بیٹھ جائے۔یہ سامان زیست لوگو ں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔لہٰذا اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی فرد رزق سے محروم نہ ہونے پائے۔تاکہ استحصال اور اس کے نتیجہ میں دہشت گردی کی جڑ ہی کٹ جائے۔

نوع انسانی کے امت واحدہ کے تصور کے بعد' اب یہاں قرآن کے نظریہ ذات کی نشوونما کا قرآنی اصول

سامنے لایا جاتا ہے۔

ذات کی نشوونما کا قرآنی بنیادی اصول

قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ ذات کی نشوونما انسانوں کے مقرر کردہ معیار کے مطابق نہیں۔ بلکہ اللہ کی طرف وحی کے ذریعے اپنے بنیادی اور اساسی اصول کو قرآن کی روشنی میں واضح کرتا ہے کہ اسی لیے فرمایا ہے کہ

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى (النجم 53:32)

تم خود ہی فیصلہ نہ کرلو کہ تمہارا تزکیہ نفس ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق خدا بہتر جانتا ہے۔

اس لیے کہ قرآن کی روشنی میں وہی ذات حامل تزکیہ نفس ہوتی ہے جو

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى. (الیل 92:18)

تزکیہ نفس اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو (راہ خدا میں) دیتا ہے۔

اس آیت میں مالہ میں میں عموماً مال ۔ہٗ کی ترکیب کے تحت اس کا مال یا ملکیت کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ مالہٗ کی ایک دوسری ترکیب بھی ہے جو ما۔لہٗ کے تحت پہلے مفہوم کو وسعت دے کر اس میں بشمول مال دیگر صلاحیتیں بھی شامل کر دیتی ہے جو فرد کو خدا کی طرف سے بطور نعمت و فضل عطا ہوتی ہیں۔قرآن کی عمومی تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے تو دوسرا مفہوم زیادہ موزوں ہوتا ہے جبکہ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ جماعت مومنین جنت کے عوض میں مال کے علاوہ جان بھی عندالضرورت پیش کرنے کا معاہدہ کرتی ہے۔

قرآن نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ انفاق مال فی سبیل اللہ میں فرد کی اپنی ذات کی نشوونما میں اسی کا فائدہ مضمر ہوتا ہے۔

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ (البقرہ 2:272)

اور جو کچھ مال و دولت تم (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہو، وہ تمہاری ذات کے فائدے ہی کے لیے ہے۔

یہاں قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ فائدہ سے مراد انسانی جسم کا نہیں بلکہ انسانی ذات کا فائدہ مقصود ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا اصول ہے جس کے تحت اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے یہی خیر و شر کا معیار ہے۔

طبیعی جسم کی پرورش کے لیے قانون یہ ہے کہ ہر فرد کے جسم کی پرورش اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھاتا ہے یہ ناممکن ہے کہ اچھی خوراک تو میں کھاؤں اور پرورش میرے بھائی کے جسم کی ہوتی جائے یہ خودغرضی ہے جس پر طبیعی سطح پر کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔

لیکن اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لیے دے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے حیوانی (یعنی طبیعی) زندگی اور انسانی (یعنی ذات کے تصور پر مبنی) زندگی کے راستوں

میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔طبیعی زندگی کے لیے ''لینا'' ضروری ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کا اصول ''دینا'' ہے اول الذکر کے لیے اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔اگر آپ اور آپ کا ہمسایہ بھوکے ہوں اور روٹی ایک ہی ہو تو جب تک آپ اپنے ہمسایہ پر ترجیح دے کر وہ روٹی خود نہیں کھائیں گے۔ آپ کے جسم کی پرورش نہیں ہو سکے گی۔لیکن انسانی ذات کی نشوونما کے لیے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔جو لوگ اس نہج پر زندگی بسر کرتے ہیں ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ لوگ ہیں۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (الحشر 59:9)

جو اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے انھیں خود تنگی میں گزارکیوں نہ کرنا پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینے سے بچ جاتا ہے تو انہی لوگوں کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

اس آیت میں کہا گیا ہے **من یوق شحُ نفسہ فـاُولٰئک ھم المفلحون** جو شحُ نفس سے بچ جائے وہی کامیاب ہوسکتا ہے شحُ نفس کسے کہتے ہیں اسے سمجھنے کے لیے اس منظر کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہے پانی کا نل صرف دو گھنٹے کے لیے کھلے گا۔اس میں پانی بہت کم مقدار میں نکلے گا۔ پانی لینے والوں کو دیکھئے تو یہاں سے وہاں تک خالی برتنوں کی قطار نظر آئے گی۔ایسے میں ہر شخص کی خواہش (بلکہ کوشش) یہ ہوگی کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی بھرے۔اس جذبہ کو شحِ نفس کہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جو شخص اس جذبے سے محفوظ رہے اور دوسروں کو پیچھے دھکیلنے کی بجائے خود پیچھے ہٹ جائے اور زیادہ ضرورت مند کو پہلے پانی لینے دے۔اسی کی کھیتی پروان چڑھے گی۔طبیعی قانون کی رو سے کھیتی اس کی پروان چڑھتی ہے جس کی زمین کو بروقت پانی مل جائے لیکن قرآنی نظام ربوبیت کی رو سے اس فرد کی ذات کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے جو پانی کا رخ دوسروں کی کھیتیوں کی طرف موڑ دے''دوسروں'' سے مراد صرف اپنی جماعت' اپنی پارٹی' اپنی قوم' اپنے لوگ' اپنے مذہب کے افراد نہیں۔

اس میں تمام نوع انسان کے وہ افراد (بلحاظ مذہب' رنگ' قوم' ملک سب شامل ہیں) جن کو ضرورت ہو۔اس کے لیے قرآن کا بنیادی اصول جو وہ ایک مثال کے ذریعے سامنے لاتا ہے درج ذیل آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اَنزَلَ مِنَ السَّمَاء مَاء فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَداً رَّابِياً وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاء حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ

الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاء وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الأَمْثَال.
(الرعد 13:17)

وہ (اللہ) بادل سے پانی اتارتا ہے پھر نالے اپنے اپنے اندازے کے موافق بہ نکلتے ہیں۔ پس سیلاب جھاگ کو اوپر اٹھا لیتا ہے اور اس میں جسے آگ میں تپاتے ہیں زیور یا سامان بنانے کے لیے اس طرح جھاگ ہوتا ہے اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے۔ سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور وہ (پانی) جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے زمین میں ٹھہرا رہتا ہے اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کائنات میں صاف اور ستھرے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی ہے اور خوشگواریوں کے ساتھ ناخوشگواریاں بھی۔ خیر کے ساتھ شر بھی ہے اور حق کے ساتھ باطل بھی۔ اس لیے کہ یہاں خیر وشر اور حق و باطل کا قانون کارفرما ہے اور اس کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے زمین کا میل کچیل، جھاگ بن کر زمین کی سطح پر آجاتا ہے۔ تو سیلاب کی رو اسے بہا کر لے جاتی ہے اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے۔

یا اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے تاکہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ، جھاگ بن کر اوپر آجاتا ہے اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے۔

اس طرح کائنات میں خدا کے قانون کشمکش کے مطابق تعمیری (خیر) قوتیں تخریبی (شر) قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوع انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْض
یعنی:

1- جو چیز (نظام یا نظریہ) انفرادی گروہ بندانہ مفاد پر مبنی ہوتی ہے مٹ جاتی ہے اور

2- جس نظام کا مطمع نگاہ نوع انسانی کی منفعت ہوتا ہے، باقی رہ جاتا ہے۔

کائنات کا یہی اصول کلی ہے۔ ثبات اور بقا لہٰذا خیر وہی نظریہ یا نظام ہے جو انفرادی مفاد خویش کی بجائے، کلی انسانیت کے لئے نفع کا حامل ہو۔ یہ ہے وہ محور جس کے گرد قرآن کا نظریہ خیر کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ یہی خیر وشر کا معیار ہے جس کے پیمانے میں ہر شے کا جائزہ لے کر خیر وشر کے ترازو میں تولا جاسکتا ہے۔

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْض.
(الرعد 13:17)

دنیا میں بقاء اس عمل کے لیے ہے جو تمام نوع انسان کے لیے نفع بخش ہو۔

یہ ہے قرآن کی رو سے انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اصول اور خیر وشر کے معیار کی کلید۔ اس اصول کے مطابق قرآن ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کے لیے مصروف سعی وعمل رہتا ہے اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوگی اور یہی اس کی زندگی کا منشاء مقصود ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما کے لیے قرآن جو پروگرام تجویز کرتا ہے اس کی رو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کی تکمیل میں ایسا جذب ہو جائے کہ دوسروں کی نشوونما کو نظر انداز کر دے۔ اس کا پروگرام ہی یہ ہے کہ جس قدر کوئی فرد دوسروں کی نشوونما کرتا ہے اس قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔

قرآن نے انسان کو بطور فرد نعمائے خداوندی کا مالک بنا کر اسے جمع کر لینے کی ہدایت نہیں کی۔ اس کے برعکس اسے اس کی تحویل میں دیتے ہوئے اور امین کا درجہ دیتے ہوئے اسے کھلا (Available) رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اس سے مقصد ان کا نوع انسانی کی بہبود ہے نہ کہ انسان کے جبلی تقاضوں پر مبنی خواہشات کا اتباع۔

وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ.
(البقرہ 2:219)

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق (فی سبیل اللہ) کریں۔ کہہ دے جو بچے اپنی ضروریات سے

خیر بطور نوع انسانی کے لیے نفع بخش

فلاح و بہبود کے کاموں کو پارٹیوں، گروہوں، ملکوں اور قوموں کے دائرہ میں محدود کر دینا مستقل اقدار کے بنیادی تصورات کے خلاف ہے، قرآن کی رو سے بقائے دوام صرف اس عمل کو حاصل ہے جو تمام عالم انسانیت کی نفع بخشی کے لیے کیا جائے۔

اس کا واضح ارشاد ہے کہ:

وَأَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِیْ الْأَرْضِ. (الرعد 13:17)

اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین پر ٹھہر جاتی ہے۔

زمین میں استمرار اور دوام صرف اس کو حاصل ہوگا جو تمام نوع انسانی کے لیے نفع بخش ہو۔ نفع بخش نہ صرف انسانی جسم کے لیے بلکہ اس کی ذات کے لیے بھی۔ ذات کو اولیت دی جاتی ہے جب اس میں اور جسم میں Tie پڑ جائے۔

آخر میں دہشت گردی کے ضمن میں قرآن کا حتمی فیصلہ بالخصوص حکمائے مغرب کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ قرآن میں اسے فساد کے عنوان کے تحت سمجھایا جا رہا ہے جو درحقیقت صلاح کی ضد ہے۔ لغوی طور پر صلاح کے معنی ہیں حالات کا مستقیم ومتوازن رہنا لہٰذا فساد کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا۔ بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہو جانا

(تاج العروس و انگریزی ترجمہ لین (Lane)۔ مختصر لیکن واضح طور پر فساد کی شکل میں دہشت گردی میں قرآنی فیصلہ غلام احمد پرویز نے لغات القرآن کے صفحات 1282-83 میں سامنے لانے میں محنت سے کام لیا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں ان کو درج کر کے دہشت گردی کا مسئلہ اور اس کا حل نوع انسانی کے حکماء کے سامنے رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ گروہی تعصّبات سے بلند ہو کر صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

قرآن کریم نے مفسدین کے مقابلہ میں مصلحین کا لفظ استعمال کیا ہے (2:11)۔ حرث و نسل کے تباہ کر دینے کو بھی فساد قرار دیا ہے (2:205)۔ ماپ تول کو پورا نہ رکھنا۔ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا۔ معاشی ناہمواریاں پیدا کر دینا۔ لوگوں کے حقوق کو دبا لینا۔ یہ سب فساد ہے (26:183, 7:85)۔ صالح نظام کو درہم برہم کر دینا۔ صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فساد ہے۔ (27:34)۔ ارتکاب جرم کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (12:73)۔ فساد درحقیقت معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہونے کا نام ہے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ (7:74)۔ نیز ''حکمت فرعونی'' کا بھی یہی شیوہ ہوتا ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں پیدا کر کے معاشرہ کے توازن کو بگاڑتے رہیں (28:4)۔ منشائے خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ہے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں سے بقدر ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کر کے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے۔ (2:60)۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ نے جو پروگرام انسانوں کے لئے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے، اسکی خلاف ورزی کرنا فساد ہے۔ اس سے انسان کی اپنی ذات میں انتشار (Chaos) پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں بدنظمی (Disorder)۔ کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیرالعقول سلسلہ اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ اس میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے۔ اگر اس میں متعدد ''خداؤں'' کا اقتدار کارفرما ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21:22)۔ انسانی زندگی بھی اسی حسن و خوبی سے اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب یہ خدائے واحد کے ضابطۂ واحد کے ماتحت بسر کی جائے۔

آخر میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ جس دہشت گردی کے لیبل میں بے قصور افراد کا قتل اسلام کے نام سے منسوب کیا جا رہا ہے، اس دینِ اسلام کی کتاب اس ضمن میں ہدایت دیتی ہے کہ

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا م بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (المائدہ 5:32)

جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(چوتھا باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 3)

عزیزانِ گرامی قدر! اس درس میں سورۃ الفاتحۃ کی تیسری آیت ہمارے سامنے آتی ہے یعنی مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3)۔ اس سے پہلے ہمارے سامنے خدا کی صفاتِ ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت آ چکی ہیں اور ان میں بنیادی نکتہ جو بیان ہوا وہ نشوونما دینے کا تھا۔ کسی شے کے نقطہ آغاز سے اسے اس کے تکمیل تک بتدریج پہنچائے چلے جانا اور عندالضرورت ایمرجنسی کے طور پر، فجائی طور پر، ہنگامی طور پر، یہ سامان مہیا کرنا۔ بہرحال ان میں بات نشوونما کی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ نشوونما وہی دے سکتا ہے، جس کا سامانِ نشوونما پر کنٹرول ہو۔ جس کا اقتدار ہو، جس کی اتھارٹی ہو، وہی سامانِ نشوونما مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اب اگلا لفظ ہمارے پاس آتا ہے: مالک۔

''مالک'' کا مفہوم

لفظ مالک کا مادہ ''م ل ک'' ''م'' کی تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے یعنی زبر، زیر، پیش تینوں کے ساتھ: مَلِکُ، مِلْکُ، مُلْکُ. اور اس سے آگے بات ملکوت کی چلی جائے گی اور پھر مالک کے ساتھ ملکیت بھی ہے۔ بہرحال اس کا مادہ ان تین حرفوں کے ساتھ آتا ہے اور ''م'' پر زبر، زیر، پیش کی تینوں حرکتوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا''۔ ملکیت کے لیے قبضے کا ہونا اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر کسی شے کے اوپر قبضہ نہ ہو تو اسے کسی بھی قسم کی قدرت، طاقت حاصل نہیں ہوتی تو کسی چیز پر قادر اور مستولی ہونے کے لیے بنیادی طور پر یہ لفظ یا یہ مادہ آتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں کہ ''اختیار اور ارادہ یا اتھارٹی۔''

درحقیقت یہ بھی آپ دیکھیے کہ وہی قادر اور مستولی ہونے کے جو معنی ہیں، انہی میں یہ چیز آئے گی کہ اختیار بھی ہوگا، ارادہ بھی ہوگا۔ اتھارٹی کا لفظ اس کے لیے بڑا جامع ہوتا ہے لیکن جب یہ اختیار اور ارادہ کا لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس میں اس کی دو خصوصیتیں اور بھی آئیں گی اور یہی وہ خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے جب ہم خدا کو مالک کہیں گے، اس کا ''ملک'' اس کی ملک کہیں گے تو

وہ انسانوں کی ملک یا ملکیت کے تصور سے الگ ہوگا' ان کے تصورِ مملکت اور تصورِ ملک سے بھی مختلف ہوگا' جب ہم اسے خدا کی طرف منسوب کریں گے۔ تیسرے اس کے بنیادی معنی غور سے سنیے: ''وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو' وہ بنیاد جس پر کوئی عمارت استوار ہو''۔ خدا اگر اس کائنات کا مالک ہے' جیسا اس کے لیے کہا گیا ہے کہ لَـهٗ مُـلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (9:16) اور مَـلَـكُـوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:75) تو اس کا ترجمہ تو ہم یہی کریں گے کہ کائنات کی ملکیت اس کی ملک' اس کی ملکوت' خدا کے لیے ہے۔ یہاں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس پر پورا اختیار وارادہ اسی کا ہے' یہ اسی کے قبضہ کے اندر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ معنی بھی ہوں گے کہ ''اس کا یہ اختیار اور ارادہ' اس کی یہ اتھارٹی' اس لیے ہے کہ وہ اشیائے کائنات کی زندگی اور نشوونما کا سہارا بنتا ہے''۔

اب آپ دیکھیے کہ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ مالک ہونے کے اندر صرف اقتدار کا پہلو ہی تھا لیکن قرآنِ کریم نے اس لفظ کے بنیادی معنی کے اعتبار سے ''جب خدا کا مالک ہونا ہوگا' تو انسانوں کا اقتدار یا استبداد یا جبر کا پہلو اس میں نہیں ہوگا' بلکہ وہ اشیائے کائنات کی نشوونما کا سہارا بنتا ہے''۔ پھر اس مادہ میں ایک اور خصوصیت بھی ہے وہ یہ ہے کہ ''یہ وہ ذریعہ ہے جس سے دو چیزوں میں جوڑ پیدا ہو' وہ ذریعہ ہے' جس سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے''۔ اسی لیے عربوں کے ہاں ''ملاک'' گارے کو کہتے تھے ۔ آج کل اس کے لیے سیمنٹ کا لفظ بول لیجیے۔ یہ اس لیے کہ اس سے اینٹ اور پتھر آپس میں جڑ کر ایک دوسرے کی قوت کا سہارا بنتے ہیں اور یوں دیوار تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے اس میں معاملے کی درستگی' اس کا تکمیل تک پہنچ جانا' اور دو چیزوں کے درمیان تقویت کا موجب بن جانا ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ جب ہم خدا کے متعلق یہ کہیں گے کہ لَـهٗ مُـلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (2:107) تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ ساری کائنات میں اقتدار اور اتھارٹی اسی کی ہے لیکن اس میں یہ بنیادی مفہوم بھی مضمر ہوگا کہ اس کا یہ اقتدار اشیائے کائنات کی زندگی اور نشوونما کا سہارا ہے بلکہ یہ وہ اقتدار ہے' جس سے اجزائے کائنات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ گویا وہ ایک وحدت بن گئے ہیں اور ان کا یہی وہ باہمی امتزاج اور وحدت ہے' جس پہ نظامِ کائنات اس حسن وخوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔ یعنی کائنات کے ذرات میں باہمی کشش وجذب خدا کی اسی صفت کی رو سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے وہ اس کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے' اسی سے وہ ان کے ارتقائی منازل طے کر کے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

انسان کی ایک انگلی کی حرکت کہکشاں کے ایک ایک کرے کو متاثر کرتی ہے

عزیزانِ گرامی قدر! جہاں جہاں خدا کی اس صفت مالکیت کا ذکر آئے گا' وہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان معانی میں سے کون سا معنی سیاق وسباق کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ یعنی یہ سارے معانی ہمارے سامنے ہوں گے اور جس مقام پر یہ لفظ آئے گا' اس موضوع کے اعتبار سے' سیاق وسباق کے اعتبار سے' دیکھا جائے گا کہ وہاں کون سا مفہوم لینا زیادہ موزوں ہے۔ یہ جو اشیائے کائنات

میں خدا کی صفتِ ملکیت' ملکوکیت یا مالک ہونا ہے' وہ اُن کو باہمی جوڑنے کا ذریعہ بنتا ہے۔اس کو تو آج کے سائنٹسٹ ہی بیان کر سکتے تھے۔ان کی تحقیق یہ ہے کہ یوں تو کائنات کی تمام چیزیں ہمیں ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتی ہیں' یوں جیسے ریت کے ذرے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں' لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کے اندر اس قسم کی وحدت ہے کہ ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں''۔علم الاخلاقیات کا ہمارے اس دور میں جو سب سے بڑا ماہر اور امام مانا جاتا ہے اس کی ایک کتاب ہے۔ غالباً اسی کے اندر اس نے یہ لکھا ہے کہ کائنات کی وحدت کی تو یہ کیفیت ہے کہ میں اگر یہاں اپنی انگلی ہلاؤں تو کہکشاں کے ایک ایک کرّے کے اوپر بھی اس کی جنبش کا اثر جا کر پڑتا ہے۔کائنات کے کسی ایک ذرے کی نقل وحرکت اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ پوری کی پوری کائنات کو متاثر کرتی ہے اس لیے کہ ساری کائنات ایک ناقابل تقسیم وحدت (Indivisible Whole) ہے' اسی لیے اس کو Universe کہتے ہیں۔اس کے اندر یہ وحدت ہوتی ہے اور یہ وحدت' خدا کی صفتِ مالکیت ہے' یہ اس کا مالک ہونا ہے۔اس میں اتھارٹی کس مقصد کے لیے ہے؟ اس مقصد کے لیے کہ وہ سامانِ نشوونما بہم پہنچائے اور پوری کائنات کی اس وحدت کو قائم رکھے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے یہ لفظ مالک خدا کے لیے آتا ہے۔

''یوم'' کا مفہوم

اس کے بعد اگلا لفظ ہے ''یوم''۔ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (1:3)۔ اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر دن کیا جاتا ہے یعنی وہ دن جو چوبیس گھنٹے پر مشتمل ہوتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں یہ لفظ ان معانی میں بھی آتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ یہ وہ ہے جسے ہم کسی چیز کا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا مرحلہ (Stage) وغیرہ کہتے ہیں۔آپ دیکھیں کہ جب آپ Stone Age (پتھر کا زمانہ) کہتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔اس کا مطلب عمر نہیں ہوتا' تاریخ کا ایک دور ہوتا ہے۔تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: مثلاً فلاں خاندان کا دورِ حکومت۔اس کے معنی ہیں' وہ پورا زمانہ جس میں ان کی حکومت تھی۔یا مثلاً یہ مسئلہ' یہ معاملہ' مختلف ادوار میں سے گزر کر یہاں پہنچا ہے۔ یہ جتنے مفہوم ہیں' یہ دور' زمانہ' پیریڈ' منازل' مراحل' ان سب کے لیے عربی زبان میں ''یوم'' کا لفظ آتا ہے۔اسی لیے ایک طرف تو قرآن نے ہمارے دن اور رات کی گردش سے جو یوم ہوتا ہے اسے بھی ''یوم'' ہی کہا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک ''یوم'' تمہارے حساب وشمار کی رو سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے' دوسری جگہ کہا ہے کہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔اس طرح یہ یوم چوبیس گھنٹے کا تو نہیں ہے۔اس کے تو معنی ہی یہی ہیں کہ وہ پیریڈ' وہ مراحل' وہ منازل جن میں سے یہ اشیائے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے' ان میں سے ایک ایک کو ''یوم'' کہا گیا ہے۔قرآن میں اُن کے مراحل کو' اُن کے ادوار کو' اس کے زمانے کو' ان کی Age کو یوم کہہ کر پکارا گیا ہے۔لہٰذا یہاں بھی جب

یہ ''مالک یوم الدین'' کہا جائے گا تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ یہ الدین کا' کوئی چوبیس گھنٹے کا دن ہے' وہ اس کا مالک ہے' بلکہ اس کے معنی ہوں گے ''وہ دور' وہ مرحلہ' وہ منزل کہ جس میں الدین کا نفاذ ہوگا' یوں کہہ لیجیے الدین کا دورِ حکومت ہوگا'' اور اگر دورِ حکومتِ خداوندی کہہ دیا جائے تو الدین کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ جب الدین کے معنی ہمارے سامنے آئیں گے تو اس وقت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہاں ''یوم'' کے معنی چوبیس گھنٹے کا دن نہیں' بلکہ ایک پیریڈ (زمانہ) ہے' جس میں الدین اپنی محفوظ شکل میں نافذ ہوگا یا آپ جو کچھ بھی دین کے معنی کریں گے اُس دین کا جو پیریڈ (زمانہ) ہے اُس کے لیے یوم کا لفظ ہے۔ یہ معنی یہاں تک ہو گئے کہ الدین کے دور میں اتھارٹی یعنی اقتدار' خدا کے لیے ہوگا اور وہ اس لیے ہوگا کہ وہ اشیائے کائنات کی نشوونما اور ارتقا کے سامان و ذرائع پر کنٹرول رکھے' اور کنٹرول اس لیے رکھے کہ وہ ان کی درستگی کا انتظام کرے' تکمیل کا انتظام کرے' باہمی نظم وضبط رکھے' وحدت پیدا کرے' امتزاج پیدا کرے۔ اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے۔

''الدین'' کا قرآنی مفہوم

اس کے بعد جو لفظ ہمارے سامنے آئے گا وہ ہے الدین۔ اور یہ الدین وہ لفظ ہے جو پورے کے پورے اسلام کی' قرآن کی' تعلیم کا نقطہ ماسکہ (Focal) ہے۔ دین ہی تو ساری چیز ہے جس کے لیے یہ کہا گیا ہے اور پھر الدین تو صرف خالص وہی دین ہے جو خدا کا دیا ہوا ہے اور جس کے تابع یہ نظامِ کائنات چل رہا ہے' جس کے تابع انسانی زندگی کا نظام چلنا چاہیے: اس زندگی کا بھی اور آنے والی زندگی کا بھی۔ پہلے آپ دیکھیے کہ الدین یا دین کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مادہ بڑا وسیع المعنی ہے۔ بعض اوقات عربوں کے ہاں ایک مادے کے اندر متضاد معانی بھی ہوتے ہیں۔ آپ یوں نہ کہیے کہ یہ کیسے ہوا؟ ایک ہی مادے میں متضاد معانی ہوتے ہیں۔ وہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اُسی ایک مادے یا اس سے بنے ہوئے لفظ کی نسبت ایک طرف کی جائے تو ایک معنی ہوتے ہیں' وہی نسبت دوسری طرف کی جائے وہ تو اس سے دوسرے یا الٹ یا متضاد معانی ہوتے ہیں۔ الدین کا یہ لفظ ان میں سے بھی ہے۔

اب سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ الدین کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ ''اس کے معنی ہوتے ہیں غلبہ' اقتدار' حکومت' مملکت' آئین' قانون' نظم ونسق' فیصلہ' ٹھوس نتیجہ' جزا وسزا' مکافاتِ عمل وغیرہ''۔ ایک طرف تو یہ معانی ہیں اور دوسرے طرف اس کے معنی ہوتے ہیں: ''کتاب' فرماں پذیری' محکومیت''۔ یعنی جب اس کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی' تو اس کے وہ پہلے معنی ہوں گے جو میں نے ابھی عرض کیے: یعنی ''غلبہ اور اقتدار' خدا کا مملکت اور حکومت' خدا کا آئین اور قانون'' خدا کا ضابطہ اور جب اس کی نسبت انسانوں کی طرف کی جائے گی تو اس کے معنی ہوں گے: ''خدا کے قوانین وآئین ونظم ونسق کی فرماں پذیری' خدا کی اطاعت ومحکومیت' دین خداوندی کی اطاعت' محکومیت یا فرماں پذیری''۔ اور جب اس کی نسبت خدا اور انسان دونوں کی طرف جامع طور پہ ہوگی تو اس کے معنی ہوں گے:

قوانینِ خداوندی کی اطاعت' جس کا نتیجہ خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے کیونکہ دین کے معنی جزا وسزا اور مکافاتِ عمل کے بھی ہیں۔اس میں دونوں نسبتیں بھی آ جاتی ہیں' دونوں معانی بھی آ جاتے ہیں۔

میں نے اس مادے کے یہ جو معانی بیان کیے ہیں' ان کی تائید میں قرآنِ کریم کی متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔قرآن کے اس قدر کثیر مقامات میں یہ لفظ آیا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ تو ساری تعلیم کا' پورے اسلام کا' قرآنِ کریم کی بنیاد ہے' اصل ہے' نکتہ ماسکہ ہے' تو اس لیے اس کا تو متعدد مقامات میں استعمال ہونا ضروری تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اتنی زیادہ تعداد میں اس کے لیے مثالیں پیش کروں۔اگر بڑی تفصیل سے' مثالوں سے' قرآن کی آیات کی سند اور حوالوں سے' اس کا یہی مفہوم سمجھنا ہو تو پھر میری ''لغات القرآن'' کی طرف جانا چاہیے۔اس میں یہ چیز بڑی ہی وضاحت سے آئی ہے۔یہاں میں سمجھتا ہوں کہ دو تین آیات ایسی پیش کی جانی کافی ہوں گی' جن سے یہ مفہوم نمایاں طور پر سمجھ میں آ جائے۔سورۃ یوسف کا وہ مقام سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ اُن کے بھائی نے شاہی کٹورہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ط كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ط مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ط وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (12:76) تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینی شروع کی۔پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورہ نہ ملا) آخر میں یوسف کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورہ نکل آیا (دیکھو! بات کیسے تھی اور رکی کہاں جا کر! اس سوتیلے بھائی نے بن یامین کی بوری میں کٹورہ کس نیت سے رکھا تھا' لیکن اس کا یہ فعل' یوسفؑ کے لیے بن یامین کو اپنے پاس روک لینے کا موجب بن گیا)۔اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے بن یامین کو روک لینے کی تدبیر پیدا کر دی' شاہِ مصر کے قانون کے مطابق' وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔اس کے لیے مشیت ہی کوئی تدبیر کر سکتی تھی (جس سے یوسفؑ کی دلی آرزو بھی پوری جائے اور اسے کوئی ایسی بات بھی نہ کرنی پڑے جس سے وہ اپنے مقام بلند سے گر جائے) یوں ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق بلند مدارج عطا کر دیتے ہیں۔یاد رکھو! خدا کا علم' ہر صاحب علم کی علمی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ''دین الملک'' اور ''دین'' کے الفاظ کا استعمال

عزیزانِ من! اس میں دیکھیے کہ ''دین الملک'' کے الفاظ آئے ہیں یعنی شاہِ مصر کے قانون کے مطابق۔ اب دوسرا مقام دیکھیے۔سورۃ النور میں جہاں زانی اور زانیہ کی سزا کا ذکر ہے کہ انہیں سو سو کوڑے لگائے جائیں' وہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (24:2) دین اللہ کے معاملے میں تم نرمی مت برتو۔اب یہاں واضح ہے کہ دین اللہ کے معنی خدا کا نظام عدل ہے' خدا کا نظامِ قانون ہے۔یعنی خدا کے قانون کو نافذ کرنے میں تم نرمی سے کام نہ لو' نرمی نہ برتو۔یہاں بھی دین کے معنی بالکل واضح ہو

جاتے ہیں۔سورۃ التوبہ کی ایک آیت میں ایک طرف تو اس نظامِ خداوندی کے لیے یہ لفظ دین آیا ہے' جو خارجی کائنات میں کارفرما ہے اور اسی کے ساتھ ہی ان پابندیوں کے لیے بھی آیا ہے' جو اس سلسلے میں انسانوں کے اوپر عائد کی گئی ہیں' جماعتِ مومنین پر عائد کی گئی ہیں۔ یہ دونوں نظاموں یعنی خارجی کائنات کا نظام اور انسانوں کی زندگی کے اندر جو نظامِ تمدن' معاشرتی یا سیاسی نظام ہے' ان دونوں کے لیے' ایک ہی لفظ دین استعمال کیا گیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (9:36) یعنی سال کے مہینے بارہ ہیں اور یہ وہ بارہ مہینے ہیں' یعنی پورے سال کو بارہ پہ تقسیم کرنا ہے' جو تخلیقِ ارض وسما کے وقت سے اللہ کے قانون کے مطابق تھے۔ یہاں قانون کے لیے کتاب کا لفظ آیا ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ یہ پہلے بھی ایک درس میں آ چکا ہے' جہاں میں نے اس کے معنی یہ بیان کیے تھے۔ یہ تو ہو گیا وہ نظام' جو خارجی کائنات میں کارفرما ہے اور اس میں انسانوں پہ یہ پابندی لگائی کہ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (9:36) ان میں چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ کی ممانعت ہے۔ یہ انسانی زندگی کے متعلق ایک قانون آیا تو کہا ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (9:36) یہ دین قیم ہے' محکم الدین ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہاں دین دونوں معانی کے اندر آ گیا ہے: نظام کائنات کے اندر خداوندی قوانین کی کارفرمائی اور انسانوں کی دنیا کے اندر خدا کے قوانین کی پابندی۔ سورۃ آل عمران میں دیکھیے کہ اسی حقیقت کو کس طرح دیگر الفاظ میں اس سے زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت 82 کہا ہے کہ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (3:82) کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتے ہیں' کیا انہیں کسی اور دین کی تلاش ہے؟ اب یہ دیکھیے کہ یہ جو دین خداوندی یا دین اللہ یہاں کہا گیا ہے' اس کے بعد اس کی تشریح کن الفاظ میں کی گئی کہ کیا یہ کسی اور دین کی تلاش کر رہے ہیں؟ اور پھر کہا جا رہا ہے کہ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (3:82) حالانکہ یہ دیکھتے نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو چیز ہے' وہ طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ یہ ہے وہ دین جو پوری خارجی کائنات کو محیط ہے یعنی وہ نظامِ خداوندی جس کے مطابق یہ کارگاہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے دین کا مفہوم واضح ہو گیا۔ یعنی وہ نظام جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہو اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اس کے بعد یہ کہا کہ تم بھی اس کا اعلان کر دو کہ ہم خدا ہی کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور یہ وہ قوانین ہیں جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے نوعِ انسان کو ملتے چلے آ رہے ہیں اور اب قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں۔ کہا کہ اب اعلان کر دو کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (3:83) ہم قوانین خداوندی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام اسلام ہے یعنی دین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا' نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنا۔

قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں ہوگا

اسے پھر دہرادوں کہ پہلے اشیائے کائنات کے متعلق بھی یہی لفظ استعمال کیا یعنی یہ کہ وہ اسلام پر ہیں: وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:82) کائنات کی ہر شے اسلام پر ہے یعنی قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کرتی ہے' اس کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہے' اس کی اطاعت اختیار کیے ہوئے ہے' اس کے خلاف کہیں نہیں جاتی' اور تم بھی اے جماعت مومنین! کہہ دو کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (3:83) ہم بھی اسی کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔ یہ ہوا اسلام۔ اور اس سے اگلی آیت میں ہے کہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (3:84) جو شخص بھی الاسلام کے سوا' جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' کوئی اور دین اختیار کرے گا' تو وہ خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ آخرالامر دیکھ لیں گے کہ وہ کس قدر خسارے میں رہے۔ یہاں اسلام کا مفہوم بھی واضح ہو گیا اور دین کا مفہوم بھی بالکل واضح ہو گیا۔ دین نظامِ خداوندی' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا الاسلام ہے۔ کائنات میں بھی یہی نظام کارفرما ہے اور کائنات کی ہر شے اسلام سے چل رہی ہے' قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔ انسانوں کی زندگی میں بھی یہی ہونا چاہیے کہ وہ قوانین خداوندی' نظام خداوندی کی محکومیت اور اطاعت اختیار کریں۔

جماعت مومنین کے لیے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت کیوں لازم ہے؟

ان آیات سے واضح ہے کہ دین نام ہے اس نظام کا جسے قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کیا جائے' جس میں ہر فرد خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے' جس میں قانون صرف خدا کا نافذ ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت سے کیا ہوگا؟ جواباً کہا کہ انسان کے ہر عمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایسا نظام جس میں اطاعت اور محکومیت صرف قوانین خداوندی کی اختیار کی جائے' اسی صورت میں ممکن ہے کہ امت مسلمہ' جماعت مومنین' کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ ان قوانین کو نافذ کرنے کا پورا پورا اختیار و اقتدار رکھے' جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے نازل کیا ہے' اور اب قرآن کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر دین کے تمکن کے لیے مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر الدین یا الاسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ مملکت قوت کے زور پر دوسروں سے چھینی نہیں جاتی' غصب نہیں کی جاتی' اس میں سلب و نہب نہیں ہوتا۔ یہ مملکت نتیجہ ہوتی ہے جماعت مومنین کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا۔ اس کا مقصد ہوتا ہے دین کا تمکن۔ دیکھیے سورۃ النور کی اس آیت میں اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق ایسے کام کریں جو ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور نمود وظہور کا باعث ہوں' اُن سے خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اس دنیا میں حکومت اور مملکت عطا کرے گا۔ آپ غور فرمایئے کہ اس میں استخلاف فی الارض کا کتنا حتمی اور یقینی وعدہ کیا گیا ہے۔ دو چیزیں یہاں سے واضح ہو جاتی ہیں: ایمان اور اعمال صالحہ کے متعلق اگر یہ پرکھنا ہو' کہ وہ واقعی ہمارا ایمان خدا کے معیار کے مطابق ہے اور ہمارے اعمال اعمالِ صالحہ ہیں تو اس کا دیکھنے کا ٹیسٹ یہ ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ اس دنیا میں استخلاف فی الارض یعنی حکومت' مملکت حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ وعدے کے معنی قانون کے ہیں' وعدے کے معنی سنۃ اللہ کے ہیں کہ یہ اللہ کی سنت ہے' یہ اللہ کا قانون ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔

تصوف میں تو مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہوئی

عزیزانِ من! میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ جب دین مذہب میں بدل گیا تو پھر ان آیات کے معنی بھی کچھ سے کچھ ہو گئے' خلافت فی الارض کے معنی بھی کچھ اور لے لیے گئے۔ کہا گیا کہ اس سے مراد روحانی خلافت ہے۔ آپ کو شاید یہ علم نہ ہو کہ یہ جو ہمارے ہاں کے مذہبی پیرانِ طریقت ہوتے ہیں' جن کے لوگ مرید ہوتے ہیں اور ان میں سے جو زیادہ مقرب ہوتے ہیں' انہیں ان کا خلیفہ کہا جاتا ہے' انہیں خلافت عطا ہوتی ہے' تو اب یہ وہ خلافت ہے جس کے لیے مملکت کی' حکومت کی' زمین کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ روحانیت کی خلافت ہوتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اس دنیاوی خلافت سے بہت بلند و بالا چیز ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو یہاں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) کہا تھا اور پھر ارض کہا تو اس کے معنی کر دیئے گئے ارض الجنۃ یعنی جنت کی زمین میں جا کر یہ استخلاف ملے گا' یہاں نہیں لیکن یہ تو' عزیزانِ من! قرآن کریم ہے۔ یہ تو انسان کو کہیں بھاگنے نہیں دیتا' وہ خود فریبی میں مبتلا ہونے نہیں دیتا' وہ مغالطہ آفرینی کے نشانات کو ختم کر دیتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) اس کے ساتھ کہا كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) جیسا کہ ان سے پہلی اقوام کو اس دنیا میں حکومت عطا ہوئی تھی۔ اب یہ جو حکومت ہے' جو اقوامِ سابقہ کو عطا ہوئی تھی' وہ تو بہرحال اسی زمین پر ہوئی تھی۔ حکومت اس کو کہا جائے گا' مملکت اسے کہا جائے گا۔ اس کے سوا تو اس کے دوسرے معنی کیے ہی نہیں جا سکتے۔ یہ ہیں معنی استخلاف کے یعنی اسی زمین پر اپنی مملکت کا قائم ہونا۔

استخلاف فی الارض اپنے اندر ایک متمیز پروگرام لیے ہوتا ہے

اب اس استخلاف فی الارض کے لیے مقصد کیا ہے' کیوں یہ مملکت دی جاتی ہے؟ یہ ہے وہ مقصد' عزیزانِ من! جو اس مملکت کو' اس

حکومت کو دنیا کی مملکتوں اور حکومتوں سے منفرد کر دیتی ہے، مختص کر دیتی ہے، متمیز کر دیتی ہے اور یہیں پہ ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کیا ہے اور اس کے مطابق زندگی کیسے بسر کی جائے گی۔ کہا کہ یہ استخلاف فی الارض، یہ حکومت، یہ مملکت اس لیے عطا کی جاتی ہے کہ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا (24:55) مقصد اس سے یہ ہے کہ وہ دین، وہ نظامِ خداوندی جسے خدا نے ان کے لیے منتخب کیا ہے، اس کا تمکن ہو جائے، وہ عملاً قائم ہو جائے، نافذ ہو جائے Establish (ثبت) ہو جائے۔ وہ مملکت جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں خدا کی طرف سے ملتی ہے، اس کا مقصد ہوتا ہے: ''دین کا تمکن''۔ نظر آ گیا کہ دین نافذ اور قائم اور جاری و ساری ہی اپنی آزاد مملکت کے اندر ہو سکتا ہے۔

دین کے تمکن ہونے کا نتیجہ زندگی کے ایک عظیم مقصد کا حصول ہے

اب اس تمکن دین کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا (24:55) اس سے پہلے اگر یہ خوف میں رہتے تھے تو اب یہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ ہو کر امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ امن اور اطمینان کی زندگی تو زندگی کے Negative (منفیانہ) پہلو ہیں، خطرات سے محفوظ ہونا ہے۔ اس میں کوئی Achievement (فوز) نہیں ہوتی، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک پرندہ قفس کے اندر بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے لیکن صرف امن نصیب ہو جانا تو زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ امن کسی مقصد کے حصول کے لیے نصیب ہوتا ہے تاکہ انسان اطمینانِ خاطر سے اپنے اس مقصد کو حاصل کر سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مقصد کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (24:55) اب یہاں یعبدوننی کا ترجمہ آپ کو قرآنِ کریم کے تراجم میں جہاں بھی آپ دیکھیں گے ملے گا ''تاکہ وہ ہماری پرستش کر سکیں اور اس میں شرک نہ کریں''۔ تو اب یہاں پھر وہ بات واضح ہو گئی کہ پرستش کے لیے تو اپنی مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہے، پرستش تو ہر قسم کی حکومت کے اندر کی جا سکتی ہے۔ ہم ہندوستان میں تقسیم سے پہلے بھی انگریزوں کی مملکت میں، اس کے بعد بھی جو حکومت قائم ہوئی، اس میں پوری کی پوری نمازیں پڑھنے کی، روزے رکھنے کی، جتنے بھی دین کے ارکان کہے جاتے ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری آزادی تھی اور اجازت تھی حالاں کہ وہ حکومت غیروں کی تھی۔ تو سورۃ الفاتحۃ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس میں اس کے لیے اگلا ہی لفظ ''نعبد'' آئے گا۔ اس نعبد کے معنی کیا ہیں؟ اس کا معنی ہوتا ہے: محکومیت اختیار کرنا۔ کہا کہ اس مملکت کے تمکن کا، Estbalish (قائم) ہونے کا، مقصد یہ ہے کہ تم ہر خوف اور خطر سے مامون اور محفوظ ہو کر صرف ہمارے قوانین کی محکومیت اختیار کرو اور اس میں کسی انسان کے حق حکومت کا کوئی دخل نہ ہو، اس کا کوئی اقتدار نہ ہو، اس کا کوئی اختیار نہ ہو۔ یہ وہ چیز ہے جسے توحید کہا جائے گا۔ یہ قوانین خداوندی کی اطاعت ہے۔ یہ الدین یا الاسلام ہے اور اس کے بعد کہا کہ وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (24:55) دین کا مفہوم اس قدر واضح طور پر

سامنے آجانے کے بعد' جو اس سے انکار کرے گا' یا سرکشی برتے گا' تو سمجھ لیجیے کہ وہ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر گامزن ہو گیا۔

استخلاف فی الارض کے بعد حصولِ مقصد کی عملی شکل

جیسا کہ آگے چل کر' اس کے مناسب مقام پر' بتایا جائے گا کہ الدین کے دو اہم گوشے ہیں: اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے بعد جو ابھی ابھی میں نے پیش کی ہے' آپ کے سامنے یہ کہا کہ **وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ** (24:56)۔ یعنی استخلاف فی الارض سے مقصد یہ ہے کہ الدین کا تمکن ہو جائے۔ اس سے تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اقامتِ الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ کا فریضہ ادا کر سکو۔ اور اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کرو جن سے نوعِ انسانی کو زیادہ سے زیادہ سامانِ نشوونما ملتا جائے۔ یہ چیز انفرادی نہیں' اجتماعی ہے۔ یہ سب کچھ ایک نظم وضبط کے تابع ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے اجتماعی نظام کے مرکز' رسول کی اطاعت کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر نوازشاتِ خداوندی کی بارش ہوگی۔ غور فرمایا آپ نے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جسے آپ نماز پڑھنا یا زکوٰۃ دینا کہتے ہیں' اس کے لیے اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ کے الفاظ ہیں۔ کہا کہ یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے اپنی آزاد مملکت کے اندر' جہاں دین کا تمکن ہو' جہاں قوانینِ خداوندی کا تمکن نہ ہو' جہاں خدا کے قوانین' خدا کا نظام قائم نہ ہو' وہاں اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ ہو نہیں سکتی۔ دوسروں کی محکومیت میں' دوسروں کی نہیں بلکہ خود اپنی مملکت میں بھی' اگر قوانینِ خداوندی نافذ نہیں ہیں' الدین کا نظام قائم نہیں ہے' تو وہاں بھی نہ صلوٰۃ قائم ہو سکتی ہے نہ' ایتائے الزکوٰۃ ہو سکتی ہے۔

عزیزانِ گرامئ قدر! اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر آئے گا لیکن قرآنِ کریم نے سورۃ الحج میں اسے اور واضح الفاظ میں بیان [1] کر دیا' جہاں مومنین کے متعلق یہ کہا ہے کہ **اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ** (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا' ان کی اپنی مملکت قائم ہوگی' تو یہ اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے' ان تمام احکامات کو نافذ کریں گے جنہیں یہ نظام قوانین خداوندی کی رو سے صحیح تسلیم کرے گا اور ان امور سے قانوناً روکیں گے جو ان احکام کی رو سے قابل تسلیم نہ ہوں گے' غرضیکہ اس میں تمام امور کے فیصلے آخرالامر قوانین خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے: **اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ** (12:40) اور اس حکومت خداوندی کے متعلق پھر اگلی وضاحت یہ کر دی کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ

---

[1] اس کی مزید تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص۔ 163-132

حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے' تو خدا تو ہمارے سامنے نہیں آتا' وہ تو نظر نہیں آتا' وہ تو براہِ راست کوئی حکم نہیں دیتا' اس کی تو ہم بات ہی نہیں سن سکتے' تو پھر اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی' اس چیز کا کیا ذریعہ ہے کہ ہم خدا کی اطاعت کر رہے ہیں' خدا کی محکومیت اختیار کر رہے ہیں؟ اس کے لیے اس نے کہا کہ ہم اپنی اطاعت اور محکومیت ایک ڈکٹیٹر کی طرح نہیں بلکہ قانون کے ذریعے کرانا چاہتے ہیں اور وہ قانون ہم نے اپنی کتاب کے اندر غیر متبدل' مکمل اور محفوظ شکل میں دے دیا ہے۔ لہٰذا الدین کے معنی ہوں گے: وہ نظامِ زندگی جس میں خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کی جائے اور یہی قرآنِ کریم کی رو سے ایمان اور کفر میں خطِ امتیاز ہے۔ آپ غور کیجیے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت 44 میں کیسے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) یاد رکھو! جو لوگ کتاب خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے انہی کو کافر کہا جائے گا۔ خود نبی اکرم ﷺ سے بھی ارشاد فرمایا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) اے رسول! تم ان کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو۔ یہ ہے عزیزانِ من! الدین کا مفہوم یعنی وہ نظامِ زندگی جس میں حق حکومت خدا کو حاصل ہو' اسی کے احکام نافذ ہوں' اسی کے قوانین جاری وساری ہوں' اور دوسری طرف انسان ان قوانین کی اطاعت اور محکومیت اختیار کریں تاکہ ان کے نتائج خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب اور برآمد ہوں۔ یہ وہ نقشہ ہے' وہ زندگی کا نظام ہے' جسے الدین کہا جاتا ہے' جسے دین خداوندی کہتے ہیں۔ اس الدین کو قائم کرنے والے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے' یہ مسلم ہیں' یہ نظامِ حیات اسلام کہلاتا ہے اور یہ ہے وہ چیز جو اس آیت کے اندر آئی جو ہمارے سامنے ہے۔ یعنی مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:3)

یوم الدین کی کیفیت

اب اس کے معنی پھر سوچ لیجیے' یا سن لیجیے' یا سمجھ لیجیے کہ اس یوم الدین کے اندر جو کہا ہے کہ اس میں اقتدار خدا ہی کا ہوگا۔ یہ وہ دور ہوگا جس میں نظامِ خداوندی قائم ہوگا' اس میں پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ یہ یوم الدین کیا ہے' اس کی خصوصیت کیا ہے' اس میں کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! قرآن کریم کے الفاظ میں سنیے اور جھوم جھوم جایئے۔ کہا کہ جس خطہ ارض میں الدین کا نظام قائم ہو جو دور' جو زمانہ' جو پیریڈ ایسا ہو' جسے آپ الدین کا نظام کہتے ہیں' سنیے! اس کے لیے قرآن کیا کہتا ہے؟ پہلے سوال کے انداز میں کہا گیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ الدین کیا ہوتا ہے یا یوم الدین کسے [1] کہتے ہیں؟ پھر کہا کہ وَمَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:17) تمہیں خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین کیا ہے' اس دور کی کیفیت کیا ہوگی۔ ثُمَّ مَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82:18) پھر بتاؤ' پھر کہو' خدا

---

[1] اس کی مزید تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ نمبر تیس' سورہ الانفطار' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006

کے سوا تمہیں کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین کیا ہوتا ہے اور اس میں کیا ہوگا؟

حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کی ہوگی

سنیئے عزیزانِ من! کہ انسان کے بنائے ہوئے نظام میں کیا ہوتا ہے' حکومت کی شکل خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اور اس کا نام خواہ کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے' وہ دورِ قدیم کی بادشاہت یا آمریت ہو یا عہدِ حاضر کی ڈیموکریسی (جمہوریت)' ان نظاموں میں حتیٰ کہ ڈیموکریسی کے نظام میں بھی قوانین سازی کے اختیارات انسانوں کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو قانون بنانے والا گروہ ہوگا اگر وہ ایک فرد ہے' بادشاہ کی حیثیت میں یا آمر کی حیثیت میں' یا وہ افراد کا گروہ ہے جسے خواہ ایک کی بھی اکثریت کیوں نہ حاصل ہو' تو یہ انسان جو قانون بھی بنائیں گے' دوسرے انسانوں کے اوپر ان کا اطلاق ہوگا اور اقتدار اور اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا جو قانون بنائیں گے۔ اس لیے' اربابِ حکومت' خواہ ان کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو' وہ دین کے نظام کی مخالفت کریں گے۔ انہیں یہ نظام گوارا ہی نہیں ہوگا' وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکیں گے۔ یہ مفاد پرستوں کا طبقہ' سرمایہ داروں کا طبقہ اس کی سخت مخالفت کرے گا۔

قرآنی نظام کی سب سے زیادہ مخالفت آمروں' سرمایہ داروں اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی

عزیزانِ من! یہ مفاد پرستوں کا طبقہ' سرمایہ داروں کا طبقہ' دوسرا گروہ ہے جو دولت کے زور پر' محتاجوں اور محنت کشوں کو اپنے زیرِ اقتدار رکھتا ہے۔ ان کا یہ اقتدار جس قسم کا ہوتا ہے' اس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ جنگل کے جانوروں میں شیر کو سب سے زیادہ قوت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور ہے بھی یہی کیفیت' لیکن اسی شیر کو بھوکا رکھ کر ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ وہ سرکس کے رنگ ماسٹر کے اشارے پر بھیڑوں اور بکریوں سے بھی زیادہ بزدل نظر آتا ہے۔ بھوک انسان سے یہ کچھ کراتی ہے۔ تو آمروں کے بعد سرمایہ داروں کا یہ دوسرا گروہ ہوتا ہے جو دین کی مخالفت کرتا ہے اور تیسرا گروہ مذہبی پیشوائیت کا ہوتا ہے۔ اس کے اقتدار اختیار کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ خدا کے نام پر اپنی من مانیاں کرتا ہے۔ بادشاہ' حاکم' قانون ساز' حکمران طبقہ لوگوں کے جسم پر اقتدار اور اختیار رکھتا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت تو ان کے دل و دماغ پر تسلط جماتا ہے۔ وہ خدا کے نائب یا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کو تگنی کے ناچ نچواتا ہے' ہر قسم کی اطاعت ان سے کراتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ گروہ' سرمایہ داری سیکھی بدترین قسم کے نمائندہ کا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار کو تو کچھ نہ کچھ سرمایہ Invest (لگا کر) کر کے دوسروں کی محنت کو غصب کرنا ہوتا ہے لیکن یہ ایسا گروہ ہے کہ ایک پائی بھی سرمائے کے طور پر Invest (لگانا) نہیں کرتا اور محنت کش' کام کرنے والا طبقہ' اپنی محنت کی کمائی کا بہترین حصہ ان کی خدمت میں لا کر پیش کرتا ہے۔ انہیں وہ دیتا بھی ہے ان کے

پاؤں بھی چومتا ہے اور ہر وقت ان سے ڈرتا اور کانپتا رہتا ہے' انہیں کسی فوج یا پولیس کے رکھنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انہوں نے خدا کے نام سے ان کو اس قدر خائف کر رکھا ہوتا ہے کہ حرکت تو ایک طرف' اگر دل کی گہرائیوں میں بھی ان کے خلاف کبھی کوئی خیال گزرتا ہے' تو وہ کانپتا ہے' ڈرتا ہے' گھبراتا ہے۔ خواہ وہ اربابِ شریعت ہوں یا اربابِ طریقت ہوں' ان سب کی حکومت انسانوں کے دلوں کے اوپر ہوتی ہے۔ تو یہ طبقہ پہلے دونوں طبقوں سے بھی زیادہ خطرناک اور دین کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔

جھوٹ سچ کے لبادے میں

حضراتِ انبیائے کرامؑ خدا کے دین کو لے کر آتے تھے اور اسی دین یعنی اس نظام کا قائم کرنا ان کا دینی فریضہ ہوتا تھا۔ وہ ان مفاد پرست گروہوں کی انتہائی مخالفت کے علی الرغم اس نظام کو قائم کر دیتے تھے لیکن ان کے تشریف لے جانے کے بعد یہ گروہ پھر سے سر نکالتے اور اسے درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے یہ تینوں گروہ آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے تھے اور مذہبی پیشوائیت ان میں آگے آگے ہوتی تھی۔ اس کی خاص وجہ تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ جھوٹ اپنی اصلی شکل میں سامنے آ کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا وہ سچ کا لباس اوڑھ کر آتا ہے تو دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے۔ یہ شخص آپ کے پاس آ کر گھنٹہ بھر تک آپ سے نہایت بلند قسم کی آپ کے مقصد کی' آپ کے مطلب کی' باتیں کرتا ہے۔ اس انداز میں کرتا ہے کہ اس میں نظر ہی نہیں آتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی مقصد ہوگا یا اس میں کوئی شائبہ بھی مکاریت یا فریب کا ہوگا۔ اس طریق سے آپ Convince ہو جاتے ہیں' آپ مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس سے وعدہ کر لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے' آپ اسی طرح سے کریں گے لیکن اگر وہ شخص اٹھتے وقت یہ کہے کہ بھائی صاحب! میں نے اس گھنٹہ بھر میں جو کچھ آپ سے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی سچا نہیں ہے وہ سب جھوٹ ہے تو کہیے اس کے بعد بھی آپ وہی کچھ کریں گے جو کچھ وہ آپ کو کہہ گیا تھا۔ اس شخص کی کامیابی کا راز اس میں تھا کہ وہ جھوٹ کو سچ کے لبادہ میں پیش کرے اور آخر تک یہی کہے کہ یہی سچ ہے۔ چنانچہ یہ مذہبی پیشوائیت جو کچھ کرتی تھی' ان کی ٹکنیک یہ تھی کہ وہ دین کی اصطلاحات کو اسی طرح سے باقی رکھتی تھی لیکن ان کے معنی اور مفہوم کو بدل دیتی تھی۔ دین کے نظام کے جو ارکان' شعائر جس انداز میں وہ محسوس طور پر سامنے آتا ہے' اس کی وہ شکلیں وہ تمام کی تمام' اسی طرح سے برقرار رکھتے تھے لیکن ان کا مقصد بدل دیتے تھے' بلکہ ان کو مقصود بالذات بنا دیتے تھے یعنی رسمی طور پر اگر وہ کچھ کرتے چلے جائیے تو وہ کہتے تھے کہ یہ صحیح بات ہے' یہ خدا کی منشا کے مطابق ہے' یہ دین کا مقصد پورا کر دیتی ہے۔ تو یہ محض (Formalism) جسے (رسماً) یعنی ظاہر رسمی طور پر ان چیزوں کو ادا کیے جانا ہے۔ وہ قوم کو اس میں الجھا کے' اس فریب میں مبتلا رکھتی تھی کہ دین کا منشا پورا ہو رہا ہے' خدا اور اس کا رسول تم سے بے حد راضی ہیں یا کہا جاتا ہے کہ دنیا میں تو اس کا کوئی نتیجہ سامنے آتا نہیں تو وہ کہتے کہ صاحب! یہ دنیا دارالعمل ہے' دارالجزا تو اس کے بعد کی دنیا ہے' اس کا نتیجہ آخرت میں جا کے آپ کو ملے گا' یہ کچھ کر کے آپ کو

ثواب حاصل ہوتا ہے اور ثواب کے نتیجے میں جو جنت ملتی ہے' وہ آخرت میں جا کر ملتی ہے۔ اس طرح سے یہ مذہبی پیشوائیت کا طبقہ' عوام کو جھوٹی تسلیوں میں' افیون دے دے کر' تھپکیاں دے دے کر' سلائے رکھتا تھا اور ملوکیت یعنی اربابِ حکومت اور سرمایہ دار طبقہ اپنی من مانی کیے چلا جاتا تھا۔ مذہبی پیشوائیت کا طبقہ جو یہ انداز اختیار کرتا تھا' وہ دین کو اس شکل میں بدل دیتا تھا' جس کا نام مذہب ہے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مذہب کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا

مذہب کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ یہ غیر قرآنی لفظ ہے اور پھر اسی لفظ مذہب کا ترجمہ انگریزی میں Religion ہوا۔ اب آپ دیکھیں گے اسلام کو بھی مذہب کہا جاتا ہے۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ مذہب اسلام کہا جاتا ہے کہ یہ مذاہب عالم میں سب سے بلند مذہب اور افضل ہے۔ ہمارے مناظرے' ہمارے مباحثے' سارے اس بات کے لیے ہوتے تھے کہ اسلام کو باقی مذاہب کے مقابلے میں سب سے افضل ثابت کر دیا جائے یعنی ان چیزوں کے مقابلے میں افضل کہ جن میں یہ تو ہے ہی نہیں۔ اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو زندگی کے جو نظام ہیں' ان سے مقابلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اس کے متعلق کہا تھا لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) دنیا کے جو یہ تمام نظام ہیں' ان کے اوپر غالب آئے گا۔ اس نے یہ کہیں نہیں کہا تھا کہ یہ مذاہب کے مقابلے میں غالب آ جائے گا۔ یہ مذہب تو ہے ہی نہیں' یہ تو دین تھا لیکن مذہب پرست طبقے یا مذہبی پیشوائیت کی پوری کوشش یہ ہے کہ دین کو مذہب کی شکل میں باقی رکھا جائے' قائم رکھا جائے اور وہ اس کو دیتے چلے جائیں اور زیادہ شدت کے ساتھ رکھا جائے کہ جتنا زیادہ یہ شدت اختیار کرتا چلا جائے گا اتنا ہی دین دور ہوتا چلا جائے گا۔

حضرت شعیبؑ کی اپنی قوم کے ساتھ مخالفت کی وجہ نظام صلوٰۃ کی تشکیل تھی

دین کو مذہب میں بدلنے کی دو ایک نمایاں سی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ تو خدا کا دین لاتے تھے اور اس کو قائم رکھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے داستانِ حضرت شعیبؑ [1] میں کہا ہے کہ وہ قوم سرمایہ پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی اور مذہب پرست طبقہ انہیں مطمئن رکھتا تھا کہ یہی خدا کا منشا ہے اور اسی کے مطابق یہ سارا نظام قائم ہے۔ حضرت شعیبؑ اس قوم میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سرمایہ پرستی کے خلاف جہاد کرنا تھا' آواز بلند کرنی تھی۔ جب نبی پیدا ہوتا ہے تو وہ تو تنہا ہوتا ہے یا بہت تھوڑے سے لوگ اس کے ساتھ ہوتے ہیں' غلبہ اور کثرت تو مخالفین کی ہوتی ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اُن سے یہ کہا کہ دیکھو بھئی! ان

---

[1] تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰ کا زمانہ 1600 تا 1700 ق م کے لگ بھگ ہے۔ (پرویز: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994' ص۔280۔

چیزوں کی مخالفت کرتے ہو لیکن مجھے صلوٰۃ کی اجازت تو دے دیجیے تو ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ پوجا پاٹ کی کوئی قسم ہے' جیسے کہا گیا کہ سر! مجھے نماز پڑھنے کی اجازت دے دیجیے تو اس کی مخالفت کوئی بھی نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں ہمارا جاتا ہی کیا ہے۔ ہم اپنے معبودوں کی ایک طریق سے بھگتی یا پرستش کرتے ہیں' یہ اپنے انداز سے کر لیا کریں تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو اس کی اجازت ہے۔ اب جب حضرت شعیبؑ نے صلوٰۃ قائم کرنا شروع کی تو وہ حیران ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ **قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا** (11:87) شعیبؑ! ہم نے تو تمہیں نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے' جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکیں؟ یہ کس قسم کی صلوٰۃ ہے؟ جو ہمارے معاشی نظام کے اوپر بھی غالب آنا چاہتی ہے' وہ اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔ ہم تمہیں اس طرح کی تو اجازت نہیں دے سکتے۔ ہم تو تمہیں ایشور کی بھگتی' پوجا' ڈنڈوت' ورشپ (پرستش) کی اجازت دے رہے تھے' صلوٰۃ کی تو اجازت نہیں دیتے تھے۔

یہودیوں کی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت

عزیزانِ من! اس سے آپ نے سمجھ لیا کہ انبیائے کرام جو نظام یا دین قائم کرتے تھے' اس میں صلوٰۃ کے معنی کیا ہوتے تھے اور وہ جو مذہب پرست طبقہ تھا' وہ صلوٰۃ کو کیا سمجھتا تھا۔ یہ پہلی مثال دیکھیں۔ اس طبقے کی طرف سے مخالفت اس قدر شدت سے ہوتی تھی اور خدا کے نبی کو انقلاب لانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ یہ اپنی انتہائی شکل میں ہمارے سامنے حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات میں آتا ہے۔ عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے' وہ تو کچھ اس قسم کا ہے کہ یہ ایک اللہ لوگ سے آدمی تھے' درویش صفت' ان کو دنیا کے معاملات سے واسطہ ہی نہیں تھا' ان کی تعلیم یہ تھی کہ ایک گال پہ کوئی طمانچہ مارے' دوسرا گال سامنے کر دو' وہ تو یہ کہتے تھے کہ دشمن کے ساتھ بھی محبت کرو تو گویا ان کی زندگی' ان کی تعلیم' اس قسم کی پیش کی جاتی [1] ہے۔

عزیزانِ من! ایک نبی کی یہ تعلیم نہیں ہوتی۔ اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اپنی اصلی شکل کے اندر دنیا میں کہیں موجود نہیں لیکن اس محرف انجیل کے اندر بھی اس قسم کے واقعات ملتے ہیں جن سے نظر آتا ہے کہ یہ کتنی عظیم شخصیت تھی اور ان کا مقابلہ مذہبی پیشوائیت سے کس قسم کا تھا۔

---

[1] آپؑ کے مکمل کوائف حیات اور پیغام کے لیے دیکھیے :: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکہف و سورہ مریم' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء حصہ مریم۔

ہیکل کے سٹیج پر سے حضرت عیسیٰؑ کا اربابِ طریقت اور اربابِ شریعت سے خطاب

اس کے لیے انجیل کے دو ایک مقامات کو دیکھیے۔ انجیل متی کے تیئیسویں (23) باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے ہیکل یعنی عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ان مذہبی پیشواؤں کو، جنہیں احبار و رہبان کہا جاتا ہے، مخاطب کر کے کہتے اور قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ وہ کیا کہتے، یہ سمجھ لیجیے کہ یہودیوں کے یہ جو مذہبی پیشوا تھے ان کا اقتدار اور ان کا اختیار کتنا تھا۔ حکومت رومن کی تھی لیکن ان کے اختیارات کی یہ کیفیت تھی کہ موت تو نہیں، اس سے کم درجے کی ہر سزا یہ خود دے سکتے تھے۔ صرف سزائے موت کے لیے انہیں ان کی منظوری لینی پڑتی تھی۔ یہ ہے ان کا اقتدار۔ ہاں تو ان اربابِ اقتدار کو مخاطب کر کے، حضرت عیسیٰؑ ان کے ہیکل پر کھڑے ہو کر، ان سے کہتے تھے: ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو!'' اس میں پیرانِ طریقت بھی آ جاتے ہیں اور اربابِ شریعت بھی آ جاتے ہیں۔ ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، کیوں کہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔'' بادشاہت کے معنی وہی دین خداوندی ہیں۔ ان سے کہتے کہ ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر ہزار افسوس! کہ یہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔'' ان کے وعظ کے ان الفاظ کو پھر سن لیجیے کہ ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔'' اور آپؑ ان سے کہتے کہ ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو..... اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے''؟

یہ سب پیغمبرانہ انقلاب تھا جو وہ دین کے مخالف مذہبی پیشواؤں کے خلاف اس دھڑلے سے اور اس اعلان سے کیا کرتے تھے۔ یہ مذہبی پیشوائیت اس قدر اس نظام کی مخالفت کرتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ عام اناجیل میں تو اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ ان چار انجیلوں کے علاوہ ایک اور انجیل ہے جسے انجیل برناباس کہتے ہیں۔ وہ ان ساری انجیلوں سے زیادہ قابل اعتماد نظر آتی ہے لیکن اُسے عیسائیوں نے آج تک چھپائے رکھا تھا۔ یہ کس طرح سے باہر آئی، اس کی داستان بڑی عجیب ہے۔ اسے میں نے اپنی کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں''[1] میں انجیل کی داستان کے قصے میں بیان کیا ہے۔ سردست یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مذہبی پیشوائیت حضرت عیسیٰؑ

---

[1] دیکھیے: شائع کردہ طلوع اسلام ٹرسٹ، رجسٹرڈ، 25 بی گلبرگ لاہور۔

کے اس نظام کی مخالفت کیوں کرتی تھی؟ اس میں لکھا یہ ہے کہ ''تب ان لوگوں نے' کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا'' یعنی یہ جو ہیکل کے پجاری تھے' اُنہوں نے' وہ جوان کا ہیڈ تھا' اس سے مشورہ کیا اور اسے کہا: ''اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا' تو ہم کیا کریں گے۔'' اب یہاں سے یہ بات نظر آتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ محض ایک فقیر اور درویش کی زندگی نہیں بسر کرتے تھے' وہ خدا کی حکومت قائم کرنے کے داعی تھے۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ ''اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے..... اس ''جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روئی عطیہ کے طور پر مانگیں۔''

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے دین کی مخالفت کی اصل وجہ

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ دین کی مخالفت کس وجہ سے ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم ''نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پر مانگیں حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم' دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں''۔ یعنی سیکولر نظام ہے' اس لیے اس میں ہم بہت خوش ہیں اور ''اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں' پس اگر ہم نے غلطی کی۔'' سنیے' عزیزانِ من! ان کا فریب نفس۔ ''اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے' قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کو راضی کر لینا ممکن ہے' مگر جب کہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی ہوگا مگر جبکہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰؑ نے لکھی ہے۔''[1] یہ ہے اصل مصیبت۔ وہ کاہنوں کا سردار کہنے لگا کہ اگر کامیاب ہو گیا تو یہ کچھ ہوگا اس لیے اس کی پوری مخالفت کرو کہ یہ کہیں کامیاب نہ ہو جائے۔

مذہب اور دین میں فرق

عزیزانِ من! دیکھا ان کی مخالفت میں جذبہ محرکہ مذہبی ہوتا ہی نہیں ہے' یہ سارا معاشی مسئلہ ہے۔ بہرحال' یہ چیز تو آگے چل کر آئے گی کہ کس طرح مذہب معاشی مسئلہ ہوتا ہے اور دین نوعِ انسانی کی معیشت کو خدا کے اقدار اور قوانین کے تابع رکھ کر نوعِ انسانی کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔ بہرحال یہ ہے فرق دین اور مذہب کا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہم نبی اکرم ﷺ کے دور میں آتے ہیں۔ حضور نے یہ نظام اس انداز کا قائم کیا کہ اس کی مثال بہت کم ملے گی لیکن جو کچھ سابقہ انبیائے کرام کے قائم کیے ہوئے دین کے ساتھ ہوا' وہی

---

[1] متی 23:36-1 اور انجیل برناباس فصل ص 142۔ یہ دیئے گئے تمام اقتباسات اس کتاب سے ماخوذ ہیں: پرویزؒ (1994)۔ شعلۂ مستور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ ص ص 60 تا 61 اور 115 تا 117۔

کچھ اسلام کے ساتھ بھی بیتی۔ صدرِ اوّل کے بعد ملوکیت نے سر ابھارا اور اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت وجود میں آ گئی۔ یہ کیسے ہوا' اس کے اسباب کیا تھے' یہ ایک بڑا اہم موضوع ہے۔ اسے میں نے اپنی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ ❶ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ دین مذہب میں کیسے بدل گیا۔ یعنی یہ مذہب میں بدل گیا تو اس سے دین کے دو حصے ہو گئے۔ جس حصے کو مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لیا' اسے دین کی بجائے مذہب کہہ کر پکارا۔ اسی کا انگریزی زبان میں ترجمہ Religion ہے۔

جب انہوں نے مذہب سے متعلق امور کو اپنی تحویل میں لیا تو دنیاوی امور حکومت کے ذمے دے دیئے گئے گویا سیکولر نظام قائم ہو گیا' وہ نظام جس میں مذہب کو حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور حکومت ان کے مذہب میں دخل نہیں دیتی۔ صدرِ اوّل کے بعد اسلام کی یہ شکل پیدا ہو گئی اور اس کی یہی شکل اس وقت تک قائم ہے' جس کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ اتباعِ شریعت کے لیے اپنی آزاد مملکت کا وجود ضروری نہیں ہے۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ ارکانِ اسلام کا اتباع ہر حکومت کے تابع کیا جا سکتا ہے' اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا خدا کا اقتدار تو اس کا دائرہ آخرت کی زندگی ہے' اس دنیا کی نہیں چنانچہ جب مذہب کی رو سے **مالک یوم الدین** (1:3) کا ترجمہ ''مالک روز جزا کا'' کیا جاتا ہے تو اس میں روز جزا سے مقصود قیامت کا دن ہوتا ہے' اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ فریب جو مذہبی پیشوائیت شروع سے دیتی چلی آ رہی ہے۔ اس میں دین مذہب میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں صرف مذاہب باقی تھے' دین کا نظام کہیں نہیں تھا اور اب بھی مسلمانوں سمیت دنیا میں مذاہب ہی موجود ہیں' دین کا وجود کہیں نہیں۔ دیگر مذاہب میں مشکل یہ تھی کہ اُن کے ہاں خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں تھی' اس لیے ان کے مذہب کا پھر سے دین میں بدل جانا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے ہاں خدا کی کتاب قرآنِ مجید اپنی اصلی غیر محرک شکل میں موجود ہے لہٰذا مسلمانوں میں پھر سے دین کے نظام کا قیام ناممکن نہیں۔ مسلمانوں کی جو آزاد مملکت یہ فیصلہ کرے کہ وہ اپنا نظام قرآنِ کریم کے تابع رکھے گی' وہ دین کے نظام کے قیام کا موجب بن جائے گی۔ میں نے ہمیشہ اس بات پر اسی لیے زور دیا ہے کہ اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہیے۔ یہ مذہب نہیں' دین ہے۔ اس لیے اسے دین کہہ کر ہی پکارنا چاہیے۔

مملکت پاکستان کے وجود کا مطالبہ کیوں؟

صدرِ اوّل کے بعد جب دین مذہب میں بدل گیا تو پھر مذہب کا وجود کیوں باقی رہا؟ اسلام دین کی حیثیت سے ہماری اس پوری

---

❶ اس آخری باب کا نام ہے: شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد' ص ص 439 تا 528

تاریخ میں کبھی قائم نہیں ہوا۔ ہمارا دور اس اعتبار سے بڑا خوش بختیوں کا دور ہے کہ اس میں یہ تصور ایک مفکر یعنی علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) کے ذہن میں ابھرا۔ انہوں نے یہ کہا کہ اسلام بحیثیت دین کے اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت ہو اور یہ ہے جسے تصورِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ [1] یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے یہ تحریک پاکستان اٹھی اور پاکستان کی جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا گیا۔ جس طرح انبیائے کرامؑ کے زمانے میں دین کی دعوت کی مخالفت ان طبقات کی طرف سے ہوتی تھی، جو مذہبی تھے، جب دین کے لیے یہ آواز اٹھی، اس کی مخالفت بھی ان کی طرف سے ہونی ضروری تھی۔ انگریز کی طرف سے مخالفت حکومت کی مخالفت تھی، ہندو کی طرف سے مخالفت اس لیے تھی کہ وہ پورے ہندوستان پر یا پورے مسلمانوں پر ہمیشہ کے لیے، مستقل طور پر، حکومت کرنا چاہتا تھا اور سب سے زیادہ قابلِ افسوس عمل یہ ہے کہ اس مخالفت میں جیسا کہ دستور چلا آ رہا تھا، ہماری مذہبی پیشوائیت پیش پیش تھی۔ نیشنلسٹ علماء نے اس تحریک کی اس قدر مخالفت کی ہے۔ ہندو اور انگریز نے براہِ راست ایسے نہیں کیا تھا۔ یہ مخالفت ان کی وساطت سے ہو رہی تھی، یہ جو تحریک پاکستان اور اس کے مقابلے میں نیشنلسٹ علماء کی، کشمکش تھی، یہ حقیقت میں مذہب اور دین کی وہی پرانی کشمکش تھی۔ یہ نیشنلسٹ علماء کہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے اور ہندو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد جس قسم کی حکومت یہاں قائم ہوگی اس میں مسلمان کو پوری پوری مذہب کی آزادی ہوگی تو اگر یہ آزادی ہمیں یہاں حاصل ہوگی تو پھر اس کے لیے جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا ہے اور اقبالؒ (1877-1938ء) انہیں سمجھاتا تھا کہ یہ آزادی مذہب کی ہوگی، دین کی آزادی نہیں ہوگی۔ دین کی آزادی کبھی بھی یہ لوگ نہیں دے سکتے۔ یہ تھا فرق، یہ تھی تحریک پاکستان اور مطالبہ پاکستان کی حقیقت، اور یہ تھی مخالفت اور یہ تھی اس مخالفت کی وجہ۔ اس ساری کشمکش کو علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے ایک شعر میں بیان کر دیا جب کہا:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کی آزادی کا مفہوم

سجدے کی اجازت کا نام اسلام کی آزادی نہیں ہے۔ اسلام کی آزادی کے معنی ہیں کہ حکومت صرف قوانین خداوندی کی ہو، کسی

---

[1] اس کی وضاحت کے لیے یہ کتابچہ دیکھئے:

Manzoor- ul- Haque, Dr, (2006). The story of pakistan:Ideological perspectives. London: Islamic Dawn Society.

اور کا اقتدار اور اختیار نہ ہو اور یہ کسی غیر کی حکومت کے تابع ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے ہم جداگانہ مملکت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ تھی' عزیزانِ من! تحریک پاکستان۔ چنانچہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کے بعد قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948ء) نے جب اس شمع کو اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے اس مقصد کو بڑے ہی جامع اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا کہ یہ جو ہم الگ جداگانہ مملکت چاہتے ہیں اس میں جو حکومت قائم کریں گے' وہ کس قسم کی حکومت ہوگی۔ 1941ء کا ذکر ہے کہ قائداعظم حیدرآباد دکن گئے' عثمانیہ یونیورسٹی کے کچھ طالب علموں نے ان سے انٹرویو کیا۔ اُس انٹرویو میں انہوں نے یہ پوچھا کہ جس اسلامی حکومت کے لیے آپ مطالبہ کر رہے ہیں اس حکومت کا امتیازی تصور کیا ہوگا' وہ کس معنی میں دوسری حکومتوں سے متمیز ہوگی۔ سنیے' عزیزانِ من! کہ اس کا جواب انہوں نے کیا دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے' جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے' نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔''[1]

تحریک پاکستان کے سلسلہ میں بولی جانے والی بھانت بھانت کی بولیاں

آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ تحریک پاکستان اور ان کے مخالفین کی یہ کشمکش کیا تھی اور وہ مقصد کیا تھا جس کے لیے یہ جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ ہمیں افسوس یہ ہے کہ آج یہاں بھی بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں کہ ہم نے جداگانہ مملکت کیوں مانگی تھی؟ اکثر و بیشتر تو یہ کہا جاتا ہے کہ اصل میں صاحب! ہندو بڑا تنگ نظر واقع ہوا تھا' وہ وہاں مسلمانوں کو جینے ہی نہیں دیتا تھا' اس لیے ہم نے تنگ آ کر ان سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ یعنی اگر ہندو کچھ کشادہ نظر ہوتا' اس کا ظرف ذرا سا بھی وسیع ہو جاتا تو ہم کبھی الگ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے۔ یہ کس قدر بڑا فریب ہے! بعض یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ سارا معاشی مسئلہ تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو کبھی بھی کارخانے قائم کرنے کی' تجارت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی' اس قدر دولت کمانے کے' مواقع ہی حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے الگ مملکت کا مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو یہ ذرائع حاصل ہو جائیں یا Opportunities (مواقع) مل جائیں'

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورہ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 320-347 مع فٹ نوٹ۔

یہ مواقع حاصل ہو جائیں۔ گویا یہ مسئلہ درحقیقت معاشی مسئلہ تھا۔ کہنے والے تو اب یہاں تک کہنے لگ گئے کہ صاحب! قائداعظم نے جب درمیان میں جو اسلام کا نام لائے تھے تو یہ ایک وکیلانہ حربہ تھا کیونکہ مسلمانوں کی قوم مذہب کے نام سے بہت جلد نیچے اترتی ہے ' ورنہ اصل مقصد جو تھا وہ یہی تھا۔

تحریک پاکستان میں پرویزؒ کی حیثیت

عزیزان من! سوچیے تو سہی۔ اصل مقصد مذہب کو دین میں تبدیل کرنا تھا اور میں یہاں اس ''میں'' کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے دس سال تک اس تحریک کے اندر خدمت سرانجام دی اور مجھے اس کی سعادت اور فخر حاصل ہے کہ میں نے قائداعظم ❶ کی معیت میں یہ خدمت سرانجام دی تو محض اس لیے کہ یہ میری زندگی کا مشن تھا' یہ میرا ایمان تھا کہ اسلام کا نفاذ اس طریق سے ہو کہ ایک آزاد مملکت ہو اور اس کے اندر قرآن کریم کا نظام اور حکومت قائم کی جائے۔ میں نے اس لیے یہ ساری کوششیں کی تھیں۔ طلوعِ اسلام کے اس زمانے کے فائل آپ کے سامنے ہوں گے۔ 1938ء میں اس کا اجراء ہوا اور وہ قائداعظم علیہ الرحمۃ کے ایماء کے مطابق ہوا تھا۔ اس نے اس زمانے میں یہ کوشش کی کہ اسلامی مملکت اسے کہا جائے گا۔ جہاں قرآن کی حکمرانی ہو۔ اس کے بعد یہاں پاکستان میں آ کر اس کا 1948ء میں دوبارہ اجراء ہوا' اور اس زمانے سے آج تک آپ اس کا کوئی ایشو اٹھا کے دیکھیے' یہی نقطہ ماسکہ ہے جس کے گرد میری تمام تحریریں گھوم رہی ہیں۔ یہ ہے' عزیزان من! مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) کا مفہوم یعنی وہ نظام خداوندی' اس کا وہ دور' وہ زمانہ' جس میں یہ نظام قائم ہوگا۔ اس میں اقتدار اور اختیار صرف خدا کو حاصل ہوگا۔

لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں عزیزانِ من! کہ کوئی الٰہ نہیں ہے' کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے سوائے اللہ کے اور یہ ایک نظری کلمہ ہے جس کا عملی مشہود اور مظہر مسلمانوں کی ایسی آزاد مملکت ہے جس میں خدا کے اقتدار و اختیار کے سوا کسی کا اقتدار و اختیار نہ ہو۔ لہٰذا اس نظام کے اندر نہ انسانوں کی حکومت رہتی ہے' نہ سرمایہ داری کا نظام رہتا ہے' نہ مذہبی پیشوائیت باقی رہتی ہے۔ خدا کی کتاب کی حکمرانی ہوتی ہے اور اس کے تابع جنہیں ہم کہتے ہیں' اربابِ اقتدار' ان کو تو کہنا ہی نہیں چاہیے' ❷ اربابِ اقتدار تو اس میں ہوتے ہی نہیں ہیں۔ جنہوں نے اس نظم و نسق کو چلانا ہوتا ہے وہ سب سے پہلے اس کی اطاعت کرتے ہیں جیسے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ انا اول المسلمین سب سے پہلے میں اس کی اطاعت اختیار کرتا ہوں اور اس کے بعد پھر وہ دوسروں سے مطالبہ کرتے تھے کہ تم بھی اس کی اطاعت اختیار

---

❶ قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948ء)

❷ قرآنی نظام میں ہر کوئی صاحب اطاعت ہوتا ہے اربابِ اقتدار نہیں ہوتا۔

کرو، اطاعت اختیار کرنا، عزیزانِ من! یہ ہے وہ شے، یہ ہے وہ مقصد، یہ ہے وہ نکتہ جو اس سے اگلے درس کے اندر پنہاں ہے جس میں کہا گیا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) یعنی اس میں بات یہاں سے شروع ہوئی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ o (1:1-3) عبدیت تمام کی تمام اس خدا کے لیے ہے، جس کے سوا کسی کا اقتدار نہیں، اس لیے کہ وہ تمام نوعِ انسانی، تمام کائنات، کی ضروریات کا ذمہ دار ہے۔ اس کی ربوبیت رحمانیت اور رحیمیت کے انداز میں دنیا کے اندر کارفرما ہوتی ہے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ جب دنیا کا کوئی ایک خطہ یہ کہنے والا ہو کہ موجود اقتدار واختیار صرف خدا کا ہو، حکومت اس کے قوانین کی ہو، پھر یہ پھیلتے پھیلتے پورے کرۂ ارض کو محیط ہو جائے۔ ان چار الفاظ کے اندر یہ بات آئی ہے۔ اس کے بعد جو اگلی بات ہے وہ اگلے درس میں میں پیش کروں گا کہ پھر کیا کہا گیا اور کیا کہلایا گیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

غیر اسلامی حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں ہوسکتی

ہمارے اس دور میں ہم مسلمانوں کو جس درجہ تباہی و بربادی کا سامنا ہے اس کی مثال ہماری ساری تاریخ میں صرف تاتاری دور کی تو ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ کبھی بھی مسلمانوں کو اس درجہ زوال و نکبت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی اور آٹھویں صدی ہجری میں مسلسل تاتاریوں کے حملے ہوتے رہے۔ یہ دور مسلمانوں کا سزا Upheaval کا دور تھا۔ تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے، اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کا بڑا سبب مسلمانوں کا باہمی اختلاف تھا۔ کیونکہ اس سے پیشتر کرّخ (بغداد کا ایک محلّہ) کو جس میں مسلمانوں کے ایک فرقہ کے لوگ آباد تھے، آگ لگا دی گئی تھی۔ اس کے ردعمل میں مسلمانوں میں آپس میں زیادہ غم و غصہ و نفرت و عداوت پیدا ہوگئی۔ ان کی نفرت سے تاتاریوں نے فائدہ اٹھایا اور چند عمائدین کا تعاون حاصل کر لیا۔ جس کی تفصیل ہماری تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہ دور شیخ سعدی کا تھا۔ چنانچہ زوالِ بغداد پر سعدی نے ایک بڑا دردناک اور الم انگیز مرثیہ لکھا تھا، جو اپنی رثائیت کی وجہ سے اب تک مشہور ہے۔ اس کا مطلع تھا کہ

آسمان را حق بود گر خون ببارَد بر زمین
بر زوالِ ملکِ مُستعصم امیر المومنین

یہ دور بڑی تباہی و بربادی کا تھا اسی وجہ سے اس دور میں تصوف کو فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ تصوف کی بنیاد Frustration ہوتی ہے اور ہمارے تمام بڑے بڑے اولیاء کرام اور صوفیائے عظام اسی دور کی پیدائش ہیں۔ تاتاریوں کا اس درجہ خوف غالب تھا کہ ایک ایک تاتاری بیس بیس مسلمانوں کو ذبح کر دیتا تھا۔ مشہور روایت ہے کہ کسی تاتاری کے پاس تلوار نہیں تھی اور اس نے کچھ مسلمانوں کو گھیر لیا تھا اس نے ان سب کو تنبیہہ کی کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں تاوقتیکہ وہ تلوار نہ لے آئے۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک تلوار لا کر سب مسلمانوں کو قتل کر دیا اور اس کا اس درجہ خوف طاری تھا کہ وہ مسلمان اس کی عدم موجودگی میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ لیکن فطرت کے اشارے اور قدرت کے تقاضے اور ہی ہوتے ہیں کہ عرصہ بعد وہی تاتاری مسلمان ہو گئے اور پھر سے مسلمانوں کی قوت و طاقت کا ق سبب بنے۔

موجودہ دور میں مستقبل قریب میں اس قسم کی کوئی توقع بظاہر معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارا دور اس معاملہ میں بہت خوش قسمت اور بلند طالع ہے کہ اس دور میں دین کا

تصور عام ہو رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے زوال کا سبب ہی یہ ہے کہ ہمارے ذہن سے دین کا تصور محو ہو گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دور بہت خوش قسمت ہے کہ جس درجہ اس دور میں دین کا تصور واضح ہوا ہے۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ آج تک یہ تصور اس درجہ عام نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ مسلمانوں میں علوم پھیل رہے ہیں اور تعلیم اور Rationalism کا فروغ ہو رہا ہے۔ معتزلہ کی چند خوبیوں کی اہمیت اور عزت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ معتزلہ اس اعتبار سے بہت لائق مدح ہیں کہ انہوں نے فکر انسانی کو بڑی اہمیت دی تھی اور وہ صرف قرآنِ کریم اور سلطانِ عقل کے ہی قائل تھے لیکن یہ بات افسوس کے ساتھ تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ تمام فکری صلاحیت کے باوجود ان کے ہاں بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آپ ہم مسلمانوں کا ہزار بارہ سو سال کا پورا لٹریچر' تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ' سب بغور مطالعہ فرمالیں۔ آپ کو کسی کا ایک لفظ دین کے بارے میں کہیں نہیں ملے گا۔ برصغیر پاک و ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادے کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے ہاں بھی اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ہمارے ہی برصغیر میں جب یہاں Rationalism کی تحریک شروع ہوئی' تو جسٹس سر امیر علی' مولوی چراغ علی' شمس العلماء علامہ محبّ الحق بہاری' سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے قرآن حکیم کے متعلق نہایت عمدہ اور حکیمانہ مضامین تحریر کئے' اور اس کے بعد پنجاب خصوصاً امرتسر میں اہل قرآن کا گروہ پیدا ہوا' جن کے سامنے خالص قرآن تھا' لیکن ان سب حضرات نے بھی' اپنے خلوص' اہلیت' قابلیت اور محنت شاقہ کے باوجود دین کا کوئی تصور پیش نہیں کیا۔ فرقہ اہل قرآن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں' لیکن انہوں نے بھی فقہ ملوکیت کو قرآنی فقہ میں تبدیل کرنے پر ہی اکتفاء کیا اور مذہب کی سطح سے بلند نہیں ہو سکے۔ دین کا تصور اجمالی طور پر علامہ اقبال نے پیش فرمایا اور اس بات کا پورا پورا Credit صرف ان کو ہی جاتا ہے' دین کے اسی تصور کو آیات قرآنی کے دلائل و براہین کے ساتھ مزین کر کے' علامہ محمد اسلم جیراجپوری نے پیش کیا۔ ان کا یہ مقالہ اس درجہ جامع' مدلل' واضح اور مسکت تھا کہ جس کی تردید نہ اس وقت بن سکی اور نہ آج بن سکتی ہے۔ پھر باقاعدہ مسلسل علمی تحریک کے طور پر اسی تصور کو عام کرنے کی سعادت مشہور و معروف مفکر قرآن محترم پرویز صاحب اور ان کی تحریک طلوع اسلام کے حصہ میں آئی۔ محترم المقام پرویز صاحب کی تو ساری عمر ہی اس تصور کو عام کرنے میں صرف ہوئی۔ ہر ہر پہلو' ہر ہر جہت' اور ہر ہر رخ سے انہوں نے دین کا تصور واضح سے واضح تر پیش کیا اور نہ صرف تصور واضح کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا واحد حل دین کا قیام ہے اور دین کے قیام سے ہی ان کی سرفرازی و سربلندی وابستہ ہے۔ ان کی ساری کتابوں کا نقطۂ ماسکہ دین کا قیام ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفاسیر' دین کے نقطہ نگاہ سے پیش کی جائیں۔ ہماری ساری سابقہ تفاسیر چونکہ مذہب کو پیش نگاہ رکھ کر تحریر کی گئی تھیں اس لئے وہ نہ صرف دین کا تصور پیش کرنے سے قاصر ہیں بلکہ ہر ہر آیت کی تفسیر دین کے تصور کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اور یہ تفاسیر و روایات ہی دین کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی حلقوں میں اور خاص طور پر علماء کے مابین یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ ''مفردات' اور 'کشاف' اگر

کسی کے زیر مطالعہ ہیں' تو اس کو قرآن فہمی میں مزید کسی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ دعویٰ مذہب کی حد تک بے شک درست ہے۔ لیکن پھر وہی مصیبت کہ یہ دونوں کتابیں قرآن کریم کی صحیح تعلیم پیش نہیں کرتیں اور صرف مذہب میں پھنسائے رکھتی ہیں۔ اس دور کے مطابق' دین کو پیش نظر رکھ کر' لغاۃ القرآن اور مطالب الفرقان (شائع کردہ از طلوع اسلام لاہور) کا مطالعہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم تک نہ صرف رسائی کرا دیتا ہے بلکہ اس درجہ خود مکتفیٰ ہے کہ یہ باقی سب تفاسیر سے مستغنی کرا دیتا ہے۔ البتہ اس بات کی ضرورت پھر بھی باقی ہے کہ اس قسم کی تفاسیر' دین کو سمجھانے کی خاطر' مزید تعداد میں تحریر کی جائیں' تاکہ سابقہ تفاسیر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ ہم جب تک سابقہ تفاسیر سے پیچھا نہیں چھڑائیں گے۔ مسلمان کسی طرح بھی ترقی و اقتدار حاصل نہیں کر سکیں گے۔

تمام انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ وہ دین کو قائم کریں اور اس میں فرقے نہ ہونے دیں۔ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (۴۲/۱۳)۔ دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ آپ سارا قرآن پڑھ ڈالیں کسی جگہ بھی مذہب کے قیام کا حکم نہیں ہے۔ سب جگہ صرف دین کے قیام پر اصرار ہے۔ دین کی کھلی کھلی' واضح اور امتیازی نشانیاں یہ ہیں کہ (۱) اس میں فرقہ بندی نہیں ہو سکتی' کیونکہ فرقہ بندی مذہب میں ہوتی ہے۔ دین میں فرقہ بندی نہیں ہوتی۔ (۲) دین کے قیام میں مسلمانوں کے پاس اقتدار کا ہونا ضروری ہے جبکہ کوئی بھی مذہب' کسی بھی ملک میں' مغلوب رہ کر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مذہب میں غلبہ شرط نہیں ہے۔ غلبہ صرف دین میں شرط ہے۔ (۳) دین میں قانون کا ماخذ Source صرف قرآن کریم ہے۔ وما اختلفتم فیہ من شئی و فحکمہ الی اللہ (۴۲/۱۰)۔ اور جس بات میں بھی جھگڑا ہو' تو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ۔ جبکہ مذہب میں ہمارے علماء کرام کی مصطلحہ ادلّہ اربعہ' یعنی قرآن کے علاوہ سنت' اجماع' قیاس بھی قانون کے مصادر و ماخذ میں شامل ہیں۔ (۴) دین میں نظام کی اطاعت کے ذریعے' اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے جبکہ مذہب میں اللہ و رسول کی اطاعت الگ الگ قرآن و روایات میں ہوتی ہے۔ (۵) مذہب میں رسول کی اطاعت ذاتی' شخصی اور نجی طور پر کی جاتی ہے' جبکہ دین میں رسول کی اطاعت' بحیثیت منصب رسالت و باعتبار سربراہ مملکت اسلامی کے کی جاتی ہے کیونکہ انبیاء و رسل کی اطاعت ذاتی طور پر نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کے منصب کی اطاعت ہوتی ہے۔ (۶) جو ان کے انتقال کے بعد ان کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی تھی۔ (۷) مذہب میں اعمال کے نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے جبکہ دین میں اعمال کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آ جاتے ہیں اور خدا جو وعدے مومنین سے کرتا ہے' اس کا دین وہ سب وعدے' اسی دنیا میں پورا کر کے دکھا دیتا ہے۔

انبیاء کرام غلطیوں سے مستثنیٰ و مبرا نہیں تھے۔ حضرت نوحؑ کو حکم ہوا احمل فیہا من کل زوج اثنین و اھلک (۴۰/۱۱)۔ ہر چیز میں سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل کو' اس کشتی میں سوار کر لو' حضرت نوحؑ کو لفظ اہل سے مغالطہ لگا اور انہوں نے دعا فرمائی کہ اے میرے خدا! میرا بیٹا تو میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ پکا ہے۔ یہ دعا حضرت نوحؑ نے اس وقت فرمائی تھی جب

انہوں نے بیٹے کو ڈوبتا دیکھا۔ چونکہ اہل کے لفظ میں ان کا بیٹا بظاہر شامل تھا اس لئے انہوں نے یہ دعا و فریاد کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ نابکار و ناہنجار تھا' اور نبی کا گھرانا صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل صالح سے بنتا ہے۔ اس لئے یہ اہل میں شامل نہیں ہوسکا اور حضرت نوحؑ کو تنبیہ ہوئی۔ انی اعظک ان تکون من الجاھلین (۱۱/۴۶)۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے نہ بن۔ پس حضرت نوحؑ نے اس تنبیہ کے بعد توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے اس توبہ کو قبول فرمالیا۔

اسی طرح قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کا ذکر ہے۔ وان یونس لمن المرسلین (۳۷/۱۳۹)۔ یقیناً یونس بھی رسولوں میں سے تھے۔ انبیاء کرام کی سنت یہی رہی ہے کہ وہ پہلے اپنی قوم کو دعوت دیتے تھے' لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے باوجود ان کی قوم ایمان نہیں لاتی تھی تو وہ خدا کے حکم کے مطابق اس مقام سے ہجرت کر کے' کسی ایسے دوسرے مقام پر چلے جاتے تھے جہاں ان کو خیال ہوتا تھا کہ ان کی تبلیغ کامیاب ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ کی قوم ان کی تبلیغ کے باوجود جب ایمان نہیں لائی تو وہ اس قوم سے مایوس بھی ہوئے اور سخت ناراض بھی۔ وہ اس قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف چلے گئے لیکن اس وقت تک انہیں خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا لیکن جب انہیں مشکلات کا سامنا ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے یہ فیصلہ خدا کے حکم سے پہلے ہی کر لیا اور یہ منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہوا۔ اگرچہ حضرت یونسؑ نے جو اقدام لیا تھا وہ ایک نیک جذبہ کے ماتحت تھا' لیکن چونکہ وہ اذن خداوندی کے بغیر کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے ان کی گرفت ہوئی۔ چونکہ گرفت آدمی کے درجہ اور مرتبہ کے مطابق ہوتی ہے اس وجہ سے ان کی گرفت بھی سخت ہوئی۔

اسی طرح حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا واقعہ بھی قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ انبیاء کرام غلطیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ اور وہ اپنے فیصلوں میں غلطیاں کر سکتے تھے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں اللہ کے نبی و رسول تھے دونوں نے ایک ہی مقدمہ کا فیصلہ ایک دوسرے کے خلاف دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک نبی کا فیصلہ درست تھا اور دوسرے کا غلط تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل کمترین کے مضمون 'شرک خفی کا نادانستہ ارتکاب' مطبوعہ طلوع اسلام' جنوری ۲۰۰۷ء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

بعینہٖ سورہ قصص میں حضرت موسیٰؑ کا واقعہ قرآن کریم نے نقل فرمایا کہ ایک دن وہ شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کو لڑتے دیکھا۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰؑ کو دیکھا تو وہ ان سے مدد کا طالب ہوا۔ حضرت موسیٰؑ اس مظلوم کو دیکھ کر' اس کی مدد کے لئے بڑھے' اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرا دیں۔ مگر وہ قبطی اپنی رعونت کی وجہ سے ان سے ہی الجھ پڑا۔ حضرت موسیٰؑ نے جو اس کو گھونسا مارا وہ وہیں مر گیا۔ اگرچہ حضرت موسیٰؑ کا ارادہ اس کو قتل کرنے کا نہیں تھا لیکن جب یہ حادثہ پیش آ ہی گیا تو انہیں اپنی غلطی پر سخت پشیمانی و ندامت ہوئی اور انہوں نے اپنے رب سے معافی مانگی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی جان پر سخت ظلم کیا۔ تو مجھے معاف فرما دے۔ چونکہ یہ غلطی ان سے بالکل بے ارادہ ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے

معافی بھی فوراً مانگ لی' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فوراً ہی معاف فرما دیا۔

مندرجہ بالا آیات کریمات سے آپ نے بخوبی اندازہ فرما لیا ہوگا کہ انبیاء کرام کے افعال ان کے ذاتی اختیار کا نتیجہ ہوتے تھے' جن میں غلطی ولغزش کا امکان ہوتا تھا اور اسی وجہ سے انبیاء کرام کی ذاتی وشخصی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور مخلوق کی اطاعت ایک جیسی نہیں ہوسکتی اللہ کی اطاعت وہ ہے جو کائنات کو پیدا کرنے والے کے لائق ہے اور مخلوق کی اطاعت وہ ہے جس کے لئے مخلوق سزاوار ہے۔ اللہ کے رسول چونکہ مخلوق ہوتے تھے' اس لئے اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت میں وہ فرق رکھنا ضروری ہے جو خالق و مخلوق میں ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت بالاصل و مطلق ہوتی ہے۔ جبکہ رسول کی اطاعت بالاصل ومطلق نہیں ہوتی۔ رسول کی اطاعت قانون خداوندی کی حدود کے اندر اندر ہوتی ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (۴/۶۴)۔ رسول کی اطاعت بالاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی اطاعت کرانے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ (۴/۸۰)۔ جس نے رسول کی اطاعت کی' اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اللہ کی اطاعت مطلق اطاعت ہوتی ہے۔ جبکہ رسول کی اطاعت کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ جن میں بہت لطیف فرق ہوتا ہے اور جن کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

رسول کی ایک حیثیت اس کی ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں اس کی اطاعت فرض نہیں ہوتی ہے۔ رسول کی ذاتی رائے یا مشورہ سے ہر شخص کو اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس اختلاف کا نام معصیت رسول نہیں ہوگا۔ احادیث مبارکہ میں اس قسم کے بہت سے واقعات درج ہیں کہ ایسے مواقع پر صحابۂ کرام حضور ﷺ سے دریافت فرما لیتے تھے کہ آپ کا یہ حکم ذاتی طور پر ہے یا یہ فرمودات وحی کی رو سے ہیں۔ اگر وہ حضور ﷺ کی ذاتی ہدایت یا خواہش ہوتی تھی' تو اس پر عمل کرنا ضروری لازمی نہیں ہوتا تھا۔ کھجور کے درختوں کو گابھا دینے کا واقعہ' اس درجہ مشہور ہے کہ یہ تقریباً ہر شخص کو معلوم ہے' نیز بدر کی لڑائی میں جو مقام حضور ﷺ نے منتخب فرمایا تھا وہ قدرے نشیب میں واقع تھا۔ صحابہ کرامؓ نے درخواست کی کہ اگر یہ مقام آپ ﷺ نے وحی کی رو سے منتخب کیا ہے' تو اس میں کوئی رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لیکن اگر آپ ﷺ نے یہ اپنی مرضی سے منتخب کیا ہے تو یہ مقام Stragically درست نہیں ہے آپ ﷺ اس کو تبدیل فرما دیں۔ صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے آپ ﷺ نے وہ مقام تبدیل کر دیا اور دوسرا جو مقام بلندی پر تھا' اسے منتخب فرما لیا۔ اس نکتہ کی وضاحت کے بارے میں حضرت مولانا اصلاحی صاحب نے اپنی مشہورِ زمانہ تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ ''بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے کوئی بات بطور تجویز یا مشورہ کے پیش کی اور صحابہ کرامؓ کو معلوم ہوا کہ یہ بات وحی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حضور ﷺ کی ذاتی رائے یا تجویز ہے تو صحابہؓ نے اس کے مقابل میں اپنی تجویزیں بھی پیش کی ہیں اور حضور ﷺ نے بعض اوقات ان کی تجویز مان بھی لی۔'' حضرت مولانا اصلاحی مرحوم کی تحریر سے ہمارے موقف کی پوری پوری

تائید وتصویب ہوتی ہے۔

اگر چہ حضرت کی تائید کے بعد اس سلسلہ میں مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں رہی' تاہم اس بارے میں ان چند مقامات کا حوالہ بھی تحریر کیا جاتا ہے جہاں قرآن کریم سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ایک تو حضرت زیدؓ کا واقعہ ہے جس کو قرآن کریم نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین کرام بھی اس کی تفصیل سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اس لئے اس کا اسی قدر حصہ پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے' جوصرف اس نکتہ کی وضاحت سے متعلق ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوا۔ واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک (۳۳/۳۷)۔اور جبکہ تم اس سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو۔'' یعنی حضرت زیدؓ دونوں کی طرف سے انعام یافتہ اور منظورِ نظر تھے اور آیۂ کریمہ کے الفاظ واذ تقول سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ حضورﷺ نے یہ بات حضرت زیدؓ سے بار بار فرمائی کہ اپنی بیوی کو نکاح میں باقی رکھو۔اگر یہ بات حضورﷺ نے صرف ایک مرتبہ کہی ہوتی تو قلت کافی تھا' تقول کی ضرورت نہیں تھی' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ نے اپنے ارادۂ طلاق کا حضورﷺ کے سامنے متعدد مرتبہ اظہار فرمایا ہوگا' مگر حضورﷺ نے ہر مرتبہ ان کو منع کیا ہوگا لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی' اور اس کے بعد بھی وہ انعام یافتہ رہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ذاتی طور پر حضورﷺ کی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ اگر حضورﷺ کی ذاتی' شخصی طور پر اطاعت لازم ہوتی اور حضرت زیدؓ پر حضورﷺ کے بار بار منع کرنے کے باوجود طلاق دیتے تو وہ معصیت رسول کے مرتکب ہوتے اور ہرگز انعام یافتہ نہ ٹھہرتے۔

قرآن کریم میں مومنین کے لئے عام حکم ہے کہ ان کے امور کے فیصلے آپس کی مشاورت سے ہوتے ہیں۔ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔اس حکم کے باوجود حضورﷺ کو ایک تاکیداً حکم الگ دیا گیا کہ وہ اپنے امور میں صحابہؓ سے مشورہ کرلیا کریں (۳/۱۵۹)۔اب اگر حضورﷺ کا ذاتی حکم حجت ہوتا' اور اس کی اطاعت لازمی ہوتی تو حضورﷺ کو مشورہ کا حکم نہ دیا جاتا۔ کیونکہ یہ بات ضروری ہے کہ کبھی تو مستشہر کا فیصلہ درست ہوتا ہے اور کبھی مستشاد کا نظریہ درست ہوسکتا ہے۔مشورہ کے بعد ظاہر ہے کہ اگر کسی صحابیؓ کا مشورہ زیادہ صائب ہوتا ہوگا' تو حضورﷺ اس کو اختیار کرلیتے ہوں گے۔اس سے ظاہر ہے کہ حضورﷺ کا ہر قول نہ تو حجت تھا اور نہ اس کی اطاعت لازمی تھی۔ البتہ جب آپ بحیثیت سربراہ مملکت کے مشورہ فرماتے تھے' اور پھر مشورہ کے بعد جو حکم جاری فرماتے تھے' اس کی اطاعت ضروری اور لازمی تھی (اس کی تفصیل آگے آتی ہے)۔

دوسری حیثیت رسول کی بحیثیت رسول و نبی کے ہوتی ہے جس میں ذاتی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ رسول بحیثیت رسول ہونے کے وحی الٰہی کے احکامات جاری کرتا ہے' اس پوزیشن میں رسول کے ہر ہر حکم کی اطاعت و فرمانبرداری لازمی وضروری ہوتی ہے۔ اس بارے میں مختلف آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ سے ہماری راہنمائی ہوتی ہے۔ سورۃ مجادلہ کی پہلی آیۂ کریمہ میں ارشاد ہوتا

ہے۔قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ (۵۸/۱)۔اے رسول! جو عورت اپنے شوہر کے بارے میں تم سے جھگڑتی تھی اور خدا سے شکایت کرتی تھی' خدا نے اس کی بات سن لی' اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں تمام مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ یہ آیت حضرت خولہ بنتِ تعلبہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ان کے شوہر حضرت اوسؓ نے ان کو ظہار کر دیا تھا (اپنی بیوی کو ماں کہہ کر اپنے اوپر حرام قرار دے دینا' ظہار کہلاتا ہے)۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہیں اس فعل سے ندامت ہوئی اور وہ اپنی بیوی سے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔اس معاملہ میں حضرت خولہؓ حضورﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور اس بات پر جھگڑتی رہیں کہ ظہار سے بیوی شوہر پر حرام نہیں ہو جاتی لیکن حضورﷺ کی رائے یہی تھی۔ یہاں تک تو حضرت خولہؓ حضورﷺ سے جھگڑا کرنے کی مجاز تھیں اور معصیت رسول کی مرتکب نہیں ہوئیں اور اپنا نظریہ پیش کرتی رہیں لیکن جب اس بارے میں آیۂ کریمہ نازل ہوگئی اور اس نے بھی ظہار کی کوئی حیثیت نہیں رکھی' اب حضورﷺ نے اس جھگڑے کا فیصلہ آیت کے ذریعے سنا دیا تو اب ان پر حضورﷺ کے قول' وحی کی اطاعت فرض ہوگئی اور اگر بالفرض آیت کریمہ ظہار کو طلاق قرار دے دیتی تب بھی ان پر اس کی اطاعت فرض تھی اور اس کی نافرمانی معصیت رسول قرار پاتی۔ حضورﷺ کی ذاتی رائے تک انہیں اختلاف کا حق تھا لیکن جب حضورﷺ کی ذاتی رائے وحی کے طور پر پیش کی جاتی پھر اس کی اطاعت فرض ہوتی۔

مزید وضاحت کی خاطر دوبارہ عرض ہے کہ حضورﷺ کے ذاتی قول وخواہش کی اطاعت لازمی نہیں تھی لیکن اگر وہی قول یا خواہش بطور وحی کے ہوتا تھا اور حضورﷺ بحیثیت رسول کے اس وحی کو پہچانتے تھے' تو پھر حضورﷺ کی اطاعت لازمی ہو جاتی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے یاایھا الذین آمنوا لا تدخلوا ببوت النبی الا ان یوذن لکم الی طعام غیر نظرین انہ ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستالسین لحدیث ان ذلکم کان یوذی النبی فیستحی منکم (۳۳/۵۳)۔اے ایمان والو! تم لوگ پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو مگر جب تم کو کھانے کے واسطے (اندر آنے کی) اجازت دی جائے (لیکن) ان کے پکنے کا انتظار نہ کرو مگر جب تم کو بلایا جائے تو (ٹھیک وقت پر) جاؤ۔ پھر جب کھا چکو تو چلے جایا کرو اور باتوں میں نہ لگ جایا کرو' کیونکہ اس سے پیغمبر کو اذیت ہوتی ہے تو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں۔

حضورﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے پیشتر ہی آ بیٹھتے تھے اور کھانا تناول کر لینے کے بعد بھی حضورﷺ سے گفتگو کرنے کے خیال سے بیٹھے رہتے تھے۔اس سے حضورﷺ کا وقت ضائع ہوتا تھا اور انہیں وقت کے ضیاع سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔اب اگر حضورﷺ ان کو ذاتی طور پر منع فرما دیتے تو ممکن تھا کہ وہ حضرات اس سے باز آ جاتے' لیکن اگر وہ باز نہ آتے اور اسی معمول کے مطابق آتے رہتے تو وہ معصیت رسول کے مرتکب نہ ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ بداخلاقی کے مرتکب ہوتے۔حضورﷺ کو بھی یہی خیال ہوگا کہ وہ لوگ چونکہ حضورﷺ سے بہت محبت کرتے تھے اور

حضورﷺ سے باتیں کرنے کے آرزومند تھے۔ اس لئے شاید منع کرنے کے باوجود بھی آتے رہیں گے' حضورﷺ کی اس خواہش کے مطابق آیات الٰہی نازل ہوئیں۔ آیات کے نزول کے بعد پھر یہ حکم الٰہی کی شکل اختیار کر گیا اب جب حضورﷺ نے یہی آیات ان حضرات کے سامنے تلاوت فرمائیں اب وہ اس بات کے مکلّف تھے' کہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی عدم اطاعت معصیت رسول کے مرادف تھی۔ اس آیت سے حضورﷺ کی ذاتی اطاعت' اور بحیثیت رسول اطاعت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

مزید گفتگو کرنے سے پیشتر یہ بات تاکیداً و توثیقاً عرض کی جاتی ہے کہ یہ صورت نہیں ہے کہ ہم کوئی خدانخواستہ' معاذ اللہ' اطاعت رسولﷺ کے منکر ہیں۔ ہم بھی دل و جان سے اطاعتِ رسول کے قائل ہیں۔ عشقِ رسول میں ڈوبے ہوئے ہیں' اور حضورﷺ سے محبت کرنے کی وجہ سے دلی آرزومند ہیں کہ

غلام مصطفیٰ بن کر میں بک جاؤں مدینے میں
محمدؐ نام پر سودا سرِ بازار ہو جائے

لیکن ہماری اطاعت کے تصور میں اور علمائے کرام کے تصور اطاعت میں یہ فرق ہے کہ وہ حضورﷺ کی اطاعت باعتبار سربراہ مملکت کے قائل نہیں ہیں۔ صرف بحیثیتِ رسول ان کی ذاتی اطاعت کے قائل ہیں' اور مذہب میں اس کے علاوہ اور کوئی راہ نکل بھی نہیں سکتی اور اس ذاتی شخصی اطاعت کر وہ حضورﷺ کے بعد ان کی احادیث کے ذریعے سرانجام دیتے ہیں۔ جبکہ ہمارا تصور اطاعت یہ ہے کہ یہ تیسری قسم حضورﷺ کی اطاعت کی باعتبار سربراہ مملکت کے ہے۔ یہ حضور کی انتظامی' عقلی' اطاعت ہے۔ جو حضورﷺ کے بعد ان کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورﷺ کی اس اطاعت کو اور مقامی حکام کی اطاعت کو قرآن نے ایک جیسا ہی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردہ الی اللہ والرسول ()۔ اے ایمان والو' اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی' اور اپنے میں سے حکام مملکت کی اطاعت کرو' تو اگر تم میں کسی چیز میں (مقامی حکام) سے جھگڑا ہو جائے تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو۔

اس آیۂ کریمہ میں یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت میں واضح فرق بیان کرنے کی وجہ سے اطیعوا کا لفظ ظاہراً بھی دو مرتبہ لایا گیا ہے۔ اللہ والے اطیعوا میں صرف اللہ کا ذکر ہے اور رسول کو اولی الامر (مقامی ماتحت حکام والے اطیعوا کے ساتھ لا کر' انہیں) کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں اطاعتیں الگ الگ دو نوعیّتوں کی ہیں۔ ایک اطاعت (پہلی اللہ والی) وحی کی اطاعت ہے اور دوسری اطاعت (پچھلی یعنی اولی الامر والی) عقلی' انتظامی' سیاسی اطاعت ہے' جس طرح اولوالامر سے مراد زندہ حاکم ہیں' یہی حال رسول کا بھی ہے جو اولی الامر والے اطیعوا ہی میں داخل ہیں کہ ان کے بعد ان کی اطاعت ان کی خلفاء جو زندہ حاکم ہوتے ہیں' ان کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ رسول اللہﷺ کی اطاعت صرف نظام کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے اور حضورﷺ کی یہی انتظامی اطاعت ان کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

فلہٰذا حضورﷺ کے بعد اسلامی مملکت کے حکمران کی اطاعت ہی رسول اللہﷺ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ اسلامی نظام یا قرآنی حکومت کے بغیر حضورﷺ کی اطاعت کسی حال میں بھی نہیں ہوسکتی۔ نظام کے بغیر حضورﷺ کی اطاعت کرنے کا تصور علماء کرام کا ہے' جو قرآن کے خلاف ہے۔ ہمارے عشق رسولﷺ کے دعاوی' سنتیں ادا کرنا' عشق رسولﷺ میں خاص وضع کا لباس پہننا' گریہ وزاری کے ساتھ نعتیں پڑھنا' عمرے ادا کرنا' رائے ونڈ کے اجتماعات میں شرکت کرنا' ماتم و مجالس عزا برپا کرنا' بغیر اسلامی نظام کے قیام کے کماحقہ بے معنے اور بے مقصد چیزیں ہیں۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً (۱۰۴/۱۸)۔ اور وہ اس خیال خام میں ہیں کہ وہ اچھے اچھے کام کر رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ طاغوتی نظام میں رہ کر اطاعت رسول ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ (نظام) تو رسول اللہ سے باغی اور عاری ہوتا ہے۔ رسول اللہ کی اطاعت صرف اور صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے اور اس کے لئے حضورﷺ کی موتیوں سے زیادہ روشن اور ہیروں سے زیادہ درخشندہ حدیث بھی دال ہے جبکہ فرمایا۔ من اطاعنی فقدا طاع اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی۔ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی امیری فقد عصانی (بخاری ومسلم)۔ جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی اس نے دراصل میری ہی اطاعت کی۔ اسی طرح میرے امیر کی نافرمانی میری نافرمانی اور میری نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

جیسا کہ صدر مضمون میں تحریر کیا گیا ہے کہ ہماری سابقہ تمام تفاسیر مذہب کی بنیاد پر تحریر کی گئی ہیں اور یہی تفاسیر اسلامی نظام کے قیام میں مانع ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کریم کی تفاسیر دین کی بنیاد پر تحریر کی جائیں اور مزید آیت کی تفسیر اسی انداز میں پیش کی جائے۔ دین اور مذہب کی تفسیر میں جو واضح فرق ہے اس کو دکھانے کے لئے نمونتہً چند آیات کی تفسیر پیش خدمتِ عالی کی جاتی ہے۔

مال فئے و مال غنیمت کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ جو کچھ رسول اللہ کسی کو دیں اسے بخوشی قبول کر لینا چاہئے اور یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ہمیں کم دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں حکم دیا گیا۔ وما اٰتکم الرسول فخذوہ' ومانھٰکم عنہ فانتھوا (۵۹/۷)۔ رسول تم کو جو دے' اسے لے لو' اور جس کے لینے سے روکے' اس سے رک جاؤ۔ ہمارے علماء کرام اس آیۂ کریمہ کو اپنے سیاق وسباق Content سے بالکل منقطع کر کے' اسکو حجیت حدیث کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت کا حجت حدیث سے دور دور تک کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس میں ایک اصولی حکم بیان فرمایا گیا ہے کہ غنیمت و فئے میں حضور جس طرح مال تقسیم فرمائیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہئے' اور اس کو ہر سپاہی بخوشی قبول کر لے۔ ہمارے علماء کرام اس کو حضورﷺ کی ذات سے وابستہ کر کے' اس سے حجت حدیث پر دلیل لاتے ہیں۔ حالانکہ یہ واضح ہے کہ مال فئے کوئی ایسی چیز نہیں جس کا حضورﷺ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہو۔ مال فئے وغنیمت انہیں شرائط کے ساتھ اب بھی خلفاء رسول و جانشین رسول تقسیم کر سکتے ہیں۔ مذہب میں تو یہ حکم

آپ کی ذات والا صفات سے وابستہ کیا جاتا ہے' لیکن دین میں عملاً یہ فریضہ حضورﷺ کے خلفاء بھی ادا کر سکتے ہیں اور اپنی صوابدید کے مطابق مال تقسیم کر سکتے ہیں اور جو حکم حضورﷺ کے متعلق تھا کہ ان کی تقسیم پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے' اس حکم کا اطلاق خلفاء پر بھی ہوگا کہ ان کی فوج کو خلفاء کی تقسیم پر راضی رہنا چاہئے۔

(۲) انما المومنون الذین آمنوا باللہ و رسولہ اذا کانوا معہ' علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ' (۲۴/۶۲)۔ایمان والے تو وہی لوگ ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان لے آئیں اور جب وہ کسی ایسے کام میں رسولﷺ کے ساتھ ہوں جس میں سب کا جمع ہونا ضروری ہے۔تو وہاں سے جب تک رسولﷺ سے باقاعدہ اجازت نہ لے لیں' چلے نہیں جاتے۔

اس آیۂ کریمہ میں پھر ہمارے علماء کرام اجتماع علی امر جامع اور استیذان' دونوں کو صرف حضورﷺ کی ذات سے محدود وابستہ کر دیتے ہیں۔حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔دین کے نظام میں ہر مومن پر فرض ہوگا کہ وہ سربراہ مملکت کے حکم پر امر جات پر حاضر ہو' اور جب تک سربراہ مملکت یا اس مملکت کی اولی الامر اس کو جانے کی اجازت نہ دیں وہ اس مجلس مشاورت میں حاضر رہے۔

(۳) واذا جاء ھم امر من الامن اوالخوف اذا عوابہ الخ۔ اور جب ان کے پاس کوئی بات امن یا خوف کی آتی ہے تو یہ اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس چیز کو رسول یا اولی الامر کے پاس آ کر پیش کر دیتے تو ان میں سے استنباط کرنے کے بعد اسے جان لیتے۔

حالانکہ یہ آیۂ کریمہ خود بول بول کر پکار رہی ہے کہ اس میں رسول اور اولی الامر سے مراد صرف خود رسول اللہ یا آپ کے دور کے اولی الامر ہی نہیں ہیں۔کیونکہ اس وقت ان افواہوں کو حضورﷺ کے سامنے پیش کرنا اور ان کے متعلق حضورﷺ سے اور اس دور کے اولی الامر سے استنباط کرانا ممکن ہی نہیں ہے۔لیکن ہمارے علماء کرام اس آیت کو صرف حضورﷺ سے متعلق قرار دے دیتے ہیں لیکن درست یہ ہے کہ یہاں واضح طور پر رسول سے مراد رسول یا ان کی جگہ دوسرے کام کرنے والے خلفاء ہوتے ہیں اور یہ انتظامی کام (استنباطِ امورِ مملکت) حضورﷺ کے بعد کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

(۴) وکیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیت اللہ و فیکم رسولہ (۳/۱۰۱)۔اور تم کس طرح کافر ہو سکتے ہو اور تم پر پڑھی جاتی ہیں اللہ کی آیتیں اور تم میں اس کا رسول (موجود) ہے۔یہاں ظاہر ہے کہ اس وقت' اس دور میں' و فیکم رسولہ' سے مراد رسول اللہ ہو ہی نہیں سکتے۔کیونکہ اس وقت ان کے انتقال کے بعد یہ آیت بے اثر ہو جاتی ہے اور اس کو قرآن میں محفوظ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن افسوس کہ مذہب کے داعی ہمارے علماء کرام' اس آیۂ کریمہ میں رسول سے مراد صرف حضورﷺ کی ذات ہی لیتے ہیں۔تفسیر عثمانی میں مرقوم ہے: ''یعنی بہت دور ہے کہ وہ قوم ایمان لائے پیچھے کافر بن جائے یا کافروں جیسے کام

کرنے لگے جس کے درمیان خدا کا عظیم الشان پیغمبر جلوہ افروز ہو اور جو شب و روز ان کو اللہ کا روح پرور کلام اور اس کی تازہ بتازہ آیات پڑھ کر سنا تا رہتا ہے۔'' جبکہ اس کا دینی مفہوم یہ ہے: ''اے جماعتِ مومنین تم حالتِ کفر کی طرف کس طرح لوٹ سکتے ہو اس لئے کہ ایمان کے راستے پر قائم رہنے کے لئے دو بنیادی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ قوانین خداوندی (اپنی اصلی شکل میں) انسان کے سامنے ہوں اور دوسرے یہ کہ ان قوانین پر عملی طور پر چلانے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی موجود ہو۔ (مفہوم القرآن' ص ۱۴۵)۔

(۵) ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاءوك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما (۴/۶۴)۔ اے رسول! جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اگر وہ تیرے پاس آتے پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش مانگتا' تو اللہ کو تواب و رحیم پاتے۔

بے شک حضورﷺ کی موجودگی میں حضورﷺ کے پاس حاضر ہونا لازمی تھا لیکن اس وقت کوئی شخص بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ اس وقت بھی حکومت کی مخالفت کرنے والوں کو حضورﷺ کے مزار شریف پر حاضر ہو کر' اور خود حضورﷺ سے صفائی کرانا اور حضورﷺ سے بخشش منگوانا ضروری ہے۔ اس وقت یہ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اس وقت تو ضروری ہے کہ اپنے حکام کے پاس جا کر معاملہ کی صفائی کرائی جائے اور حکام کو بھی ضروری ہے کہ اپنی رضامندی ظاہر کر دیں۔ اس آیۂ کریمہ سے بخوبی واضح ہے کہ اس قسم کی آیات کریمات میں حضورﷺ کے انتقال کے بعد رسول سے مراد' آپ کے خلفاء کرام ہیں۔

ان پانچ آیات کریمات کی مذہبی و دینی تفسیر پیش خدمت عالی کی گئی ہے۔ ان کے مطالعہ کے بعد' آپ خود فرمائیں کہ یہ تفاسیر دین کے قیام میں کس طرح مانع اور رکاوٹ ہیں۔

ان فی ذلک لذکریٰ لمن کان له قلب اوالقیٰ السمع وهو شهید (۵۰/۳۷)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص دل رکھتا ہے یا کان لگا کر سنتا ہے' اس کے لئے اس میں کافی نصیحت ہے۔

مراد ما نصیحت بود' کردیم
حوالت با خدا کر دیم' رفتیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

حکمت کی باتیں

(۱) جولوگ دوسروں کے سامنے اپنے مصائب کا رونا روتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ لوگ ظاہراً ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں ورنہ خوش ہوتے ہیں۔

(۲) بھلا دینے یا معاف کر دینے کا مطلب یہ ہوا کہ بڑی مشکل سے حاصل کیا ہوا تجربہ ضائع کر دیا جائے۔

(۳) تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو، ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہوسکتی۔ (اقبال)۔

(۴) بین الاقوامی دنیا میں کمزوروں سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ یہاں صرف طاقت کا احترام کیا جاتا ہے۔ (ضیاءترکی)

(۵) ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات کے تسلسل کا مطلب بجز اسکے کیا ہوسکتا ہے کہ کوئی خیالات و احساسات ہی نہیں۔ (اقبال)۔

(۶) روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ (اقبال)۔

(۷) کسی لفظ کی تعریف نہ کرو۔ اس کے استعمال (Use) پر غور کرو۔ (وٹگنسٹائن)۔

(۸) دوسری مرتبہ سوچو تو کبھی شادی نہیں کرو گے (شاید اسی لئے کانٹ نے شادی نہیں کی۔) (کانٹ)۔

(۹) شیطان کو انسان پر نہیں بلکہ انسان کو شیطان پر تصرف دیا گیا ہے۔

(۱۰) حیات، مرگِ باشرف کو کہتے ہیں اور موت، حیات بے شرف کا نام ہے۔

(۱۱) جو شخص معاشرے کی ضرورت نہیں رکھتا وہ یا تو جانور ہے یا دیوتا۔ (ارسطو)۔

(۱۲) دراصل قرآن مجید جہاں کہیں کوئی لفظ استعمال کرتا ہے، وہیں اس کے معنی بھی بیان کر دیتا ہے۔

(۱۳) عقل و حکمت کے ارتقاء کا یہ منطقی نتیجہ ہوتا ہے کہ رسم و رواج کے فرسودہ نظام کو جدید نظریات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ضرورت بڑھ رہی ہے روشنی کی جس قدر ازہرؔ اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

﴿روشنی﴾

قرآنی تعلیمات، اُسوۂ رسول ﷺ اور عقل وشعور کی روشنی میں مختلف عنوانات پر مشتمل تحقیقی نوعیت کی کتابیں، کتابچے اور مضامین

مؤلف: ڈاکٹر ازہرؔ ہراز ہری (ایم اے، پی ایچ ڈی)

شمار	عنوان	قیمت	شمار	عنوان	قیمت
1	قرآن اور حدیث	150	13	اسلامی (بلاسودی) بینکاری (کتنی حقیقت کتنا فسانہ؟)	30
2	قرآنی حدیثیں	150	14	اللہ یا خدا؟	30
3	قرآنی سود (مکمل)	150	15	انکارِ قرآن؟ (احسن الحدیث کی روشنی میں)	20
4	ظہورِ مہدی؟	150	16	قرآن اور علم فقہ	20
5	اہل بیت اور آل محمد ﷺ	60	17	قرآن، زمین اور سائنس	20
6	درود شریف اور درود ابراہیمی	60	18	الیکشن نامہ (شعری مجموعہ)	20
7	قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب	60	19	زوالِ مسلم (شعری مجموعہ)	20
8	الصلوٰۃ (نماز) کی حقیقت	60	20	حدیث اور روایت؟	20
9	شبِ بَراءت	60	21	قرآن اور حدیث، قرآنی حدیثیں، قرآنی سود (تعارف)	20
10	یہود و نصاریٰ سے دوستی	60	22	استخارہ؟ زکوٰۃ (حقیقت)	20
11	خطبۂ جمعہ کی حقیقت اور اہمیت	50	23	قرآن اور وحی	15
12	نمازِ تراویح	40	24	سچی باتیں (حصہ اول) مجموعہ مضامین	60

قسمت میں جس کی ہو گا وہ پا لے گا روشنی ازہرؔ نے دل جلا کے سرِ راہ رکھ دیا

SUPPLIERS / DISTRIBUTORS

S.S. TRADERS (INTERNATIONAL)

P.O. Box No.18077, Karachi-74700 (Pakistan) PH:021-6050088, Cell:0300-9244777

قیمت بذریعہ منی آرڈر مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کریں اور منی آرڈر فارم کے نچلے حصہ پر اپنا نام اور پتہ صاف صاف حروف میں تحریر کریں۔

پتہ: شاذف احمد، بی 215 (پہلی منزل)، بلاک "D"، نارتھ ناظم آباد، کراچی 74700

نوٹ: - قیمت کے ساتھ 25% اضافی رقم (ڈاک خرچ) ضرور شامل کریں۔ کتابیں بذریعہ وی۔ پی۔ روانہ نہیں کی جاتیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

شفاعت کا عقیدہ اور نتیجہ

مسلمانوں کو غلط پٹڑی پر ڈالنے کے لئے جو سازشیں کی گئیں ان میں ایک سازش شفاعت کا عقیدہ بھی ہے۔ لفظ شفاعت کے معنی ہیں کسی ایک شئے کا دوسری شئے سے مل جانا۔ تعاون کرنا۔ مدد کرنا۔ کسی کام میں معاون و مددگار بن کر کسی کے ساتھ ہو جانا۔ عدالت میں گواہ بن کر مدعی یا مدعا علیہ کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔ قرآن میں شفع کا لفظ طاق کے مقابلہ میں جفت (دو) ملے ہوئے نظر آنے والے ستاروں کے لئے آیا ہے (۸۹/۳)۔ ہمارے ہاں حق شفعہ دوسرے کی شے (جائیداد وغیرہ کو) اپنی شے کے ساتھ ملانے کو کہا جاتا ہے۔ ان معانی کے برعکس لفظ شفاعت کو صرف سفارش کے معنوں میں محدود رکھ کر اسے روایات کے ذریعے ایک عقیدہ کے طور پر ذہنوں میں راسخ کر کے اتنا پختہ کر دیا کہ یہ چیز ہمارے ہاں ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ایمان بھی ایسا کہ جب کسی کو گالی یا بددعا دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے جا تجھے اللہ کے حبیب ﷺ کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اس عقیدہ کی وجہ سے آئین وقوانین خداوندی کا احترام و پابندی باقی نہ رہی اور زندگی کے تمام شعبوں میں قانون شکنی کی روش سے دنیا بھر کی خرابیاں قوم کے اندر پیدا ہوگئیں۔ جس قوم کو جلسوں۔ ایصالِ ثواب کی اسمبلیوں کے علاوہ دن میں پانچ بار نماز اور اذان کے بعد ٹیلی ویژن کے ذریعے دعاؤں میں شفاعت پر توکل کی نوید سنائی جائے وہ کرپشن سے کیسے بچ سکتی ہے؟۔ ہم ہر روز رونا روتے ہیں کہ بڑی مصیبت ہے ہمارے ملک میں کوئی کام سفارش کے بغیر نہیں ہوتا۔ فلاں آفیسر سفارش کے بغیر کام نہیں کرتا اور اس آفیسر سے دلی نفرت کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں جب دعاؤں میں حضور ﷺ کی طرف سے شفاعت اور ان کے لئے بلندیٔ درجات اور مقامِ محمود کے عطا کرنے والا جملہ سن کر آمین آمین کہتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس کی زد کہاں کہاں جا پڑتی ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ نے رسہ گیر اور جرائم پیشہ لوگوں کی سفارش کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا (معاذ اللہ) بلکہ اس نے اپنے رسول کریم ﷺ کو دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس نظام حیات کو

قائم کر کے دیگر نظامہائے حیات پر غالب کیا جائے (۹/۳۳)۔سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ نے حضورﷺ سے وعدہ کیا کہ عسے ان یبعثک ربک مقاما محمودا (۷۹/۱۷) بہت جلد (Very Soon) ہم تمہیں حمد وستائش کے حامل بلند مقام پر فائز کریں گے۔ جب محمد رسول اللہﷺ (۹۲/۴۸)' اپنے مقدس ہاتھوں سے نظام ربوبیت کی بنا پر سزاوارِ حمد وستائش اللہ (۱/۱) کا عطا کردہ دین قائم کر کے' (قرآنی نظامِ حکومت کے سربراہ) اس کی سنٹرل اتھارٹی قرار پائے تو اس قرآنی نظامِ حکومت کے درخشندہ نتائج کو دیکھ کر دنیا پکار اٹھی کہ وہ ذاتِ گرامیﷺ بھی فی الواقع قابلِ حمد ہے جنہوں نے ایسا قابل حمد وستائش' انسانیت ساز' انقلاب آفرین نظام عملاً نافذ کیا اور اللہ نے اپنے اس وعدہ کے پورا ہونے کے بعد فرمایا کہ ورفعنا لک ذکرک (۹۴/۴) ہم نے تیری عزت وتکریم کو بلند کیا۔ تیرا چرچا دور دور تک پھیلا دیا۔ تجھے شرف ومجدِ انسانیہ کے معراج کبریٰ یعنی مقامِ محمود پر فائز کر دیا۔ نبی اکرمﷺ کی عظمت کا دوسرا پہلو! قیامت تک کے لئے تمام نوعِ انسانی کے لئے رسولﷺ' رحمۃ للعلمین۔ خاتم النبیین۔ جس پر نازل کردہ کتاب میں نوعِ انسانی کے لئے اللہ کے قوانین کی تکمیل ہوگئی ہو اور قیامت تک اس کتاب یعنی آپﷺ کی رسالت کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہو۔ ان کے اس بلند مرتبہ سے بڑا مرتبہ اور کیا ہوسکتا ہے؟۔ (خود نامِ محمدﷺ کے معنی ہیں جس کی مسلسل وپیہم ''حمد'' کی جائے)۔ اس کے برعکس سورۃ توبہ کی آیت میں اللہ کے فرمان کے علی الرغم دین کے راستے میں روک بن کے کھڑے ہوکر باطل طریق سے عوام کی خون پسینہ کی کمائی پر عیش وعشرت اور تن آسودہ زندگی بسر کرنے والے ہمارے فرقہ پرست علماء مشائخ (اپنے اپنے فرقہ کی شریعت کے پیروکار وپیرانِ طریقت (۹/۳۴)۔ قرآن کی آیت کے مطابق جن کا رسول اللہﷺ سے کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۶۰) یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح جھوٹے جھنڈے اٹھائے پھرتے رہتے ہیں اور اذان کے بعد' نبی عالی مرتبتﷺ کے لئے ایسی دعائیں مانگ مانگ کر ساری دنیا کے سامنے آپﷺ کی شان گھٹانے کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کے پیدا کردہ ۹۰ سال پرانے اور خون ریزیاں کرانے والے مسئلہ پر پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے آئین وقانون کے مطابق حتمی فیصلہ کے باوجود ہر سال ختم نبوت کانفرنسوں کے ذریعے اس ایشو کو زندہ رکھنے والے' توہینِ رسالت کا فریب دہ قانون پاس کروانے والے' بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سازشی حضرات کو حضورﷺ کی عظمت وتوقیر کی قدر کا علم ہی نہیں۔ توہینِ رسالت کا قانون پاس کروانے میں قرآن۔ پیغامبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو خطرناک سکیمیں پوشیدہ ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی غیر مسلم شخص کتب احادیث

میں سے خلاف قرآن ایسی روایت جس سے نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس اور علمی فضیلت پر طعن آتا ہو' کو اخذ کر کے اس کے مطابق اپنی کتاب میں مذاق اڑا دیتا ہے ظاہر ہے وہ کتاب دنیا کے تمام لوگوں کی نظروں سے نہیں گزر جاتی) تو اس کا علمی انداز میں جواب دے کر منہ بند کرنے کے بجائے یہ حضرات جانتے ہوئے کہ یہ بات ہماری فلاں حدیث کی کتاب سے اخذ کی گئی ہے اور عجمی جامعین کی کتب احادیث کی تطہیر کرنے کی بجائے الٹا اس شخص کے خلاف احتجاجی جلوس نکال کر' غیر مسلم حکومتوں سے ان کے لئے ناقابلِ عمل مطالبات کر کے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے مسلم قوم کو ساری دنیا کے سامنے رسوا کرتے رہتے ہیں۔ (معاذ اللہ)۔ اور یہ سب قرآنی نظام کے باقی نہ رہنے کے نتیجہ میں مسلمانوں کی کمزوری و ناتوانی اور عاجزی کی وجہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔

معزز قارئین! آپ نے کبھی نوٹس لیا کہ یہ حضرات دعا مانگتے وقت سفارش کا لفظ نہیں بولتے ہمیشہ شفاعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ سفارش ناپسندیدہ اور برا فعل ہے۔ اس لئے عربی کے لفظ شفاعت کا ترجمہ زبان پر نہیں لاتے لیکن ان کے اور ہمارے ذہنوں میں مفہوم تو سفارش ہی ہوتا ہے۔ ہمارا یہی عقیدہ ہے نا کہ یوم قیامت اللہ تعالیٰ کی عدالت عالیہ میں فیصلہ کے بعد مسلمانوں کا ایک گروہ جب دوزخ میں ڈال دیا جائے گا تو پھر حضور ﷺ خدا سے شفاعت (سفارش) کریں گے اور امت کے اس گروہ کو باہر نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات تو ذہنی تسکین کے لئے ناممکن کو ممکن بنانے والی ہے۔ ہاں اگر عدالت کے فیصلہ سے پہلے سفارش کی جاتی تو رہائی ممکن تھی لیکن جب ایک مجرم کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کی بنا پر عمر قید کی سزا بھگتنے کے لئے جیل بھیج دیا جائے تو پھر سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیل کے محافظوں میں سے کسی کو رشوت دے کر مجرم کو فرار تو کروایا جا سکتا ہے۔ کہہ دیا جاتا ہے تمہارا شفاعت پر ایمان ہی نہیں ہے۔ تمہیں نہیں پتہ کہ اللہ کے حبیب ﷺ شفاعت کے لئے پہل نہیں کریں گے بلکہ خدا اپنے بندے سے خود پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ شاید تم نے بخاری شریف کی حدیث نہیں پڑھی جس میں لکھا ہے کہ جب اللہ کی عدالت برخاست ہو جائے گی۔ اللہ میاں اٹھ کر فرشتوں کے جلو میں جا رہے ہوں گے تو دیکھیں گے کہ میدانِ حشر میں ایک شخص سجدے میں گرا ہوا ہے۔ اللہ فرشتوں سے پوچھے گا یہ کون شخص ہے۔ فرشتے جواب دیں گے اے اللہ یہ آپ کے حبیب رسول کریم ﷺ ہیں۔ پھر اللہ میاں آپ ﷺ کے پاس جائیں گے اور دریافت کریں گے کہ کیا بات ہے۔ حضور ﷺ عرض کریں گے کہ جب تک میرے ان امتیوں کو دوزخ سے باہر نکال کر جنت میں نہیں بھیجا جاتا نہ تو میں سجدے سے سر اٹھاؤں گا اور نہ ہی خود جنت میں جاؤں گا۔ تو پھر اللہ کے حکم سے ان

لوگوں کو دوزخ سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ مطلب ہے شفاعت سے۔ اب سمجھے۔ معاف کرنا اس سے اللہ کا کیا تصور ذہن میں آتا ہے؟۔ (اللہ کو فرشتوں سے دریافت کرنا پڑا کہ وہ کون ہیں)۔ بخاری اور ان عقیدت مندوں نے اللہ عالم الغیب اور سب کچھ دیکھنے والے کو بڑے پیر صاحب کے مقام پر رکھ چھوڑا ہے۔ معاذ اللہ۔ پیر صاحب کے مریدوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ پیر صاحب چودہ چودہ کوس کی خبر رکھتے ہیں۔ ایک دن پیر صاحب دوسرے گاؤں اپنی سالانہ فتوح (مرید کی کمائی میں سے حصہ) لینے مرید کے گھر چلے جاتے ہیں۔ مرید کی بیوی نے پلیٹ میں پہلے گھی اور شکر ڈال کر اوپر ڈھیر سارے ابلے ہوئے چاول ڈالے اور چارپائی پر پیر صاحب کے آگے رکھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر دیکھتی ہے کہ پیر صاحب کھا نہیں رہے۔ اس نے پوچھا پیر جی کھانا شروع کیوں نہیں کرتے۔ پیر صاحب بولے چاولوں کے اوپر ڈالنے کے لئے گھی شکر یا سالن وغیرلائے گی تو کھاؤں گا۔ وہ بولی آپ کی بابت تو سنا تھا کہ آپ چودہ چودہ کوس کی خبر رکھتے ہیں مگر آپ کو تو یہ بھی علم نہیں کہ گھی شکر آگے پڑی پلیٹ میں چاولوں کے نیچے پہلے ہی ڈالا ہوا ہے۔

سورۃ الانعام میں رسول کریم ﷺ سے اللہ کا حکم ہے کہ وانذربہ الذین یخافون ان یحشروا الی ربھم لیس لھم من دونہ ولی و لا شفیع لعلھم یتقون (۶/۵۱)۔ اے رسول! تو' اس قرآن کی رو سے ان لوگوں کو زندگی کے پرخطر راستوں سے آگاہ کرتا رہ جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تو نہ ان کا کوئی رفیق و مددگار ہوسکتا ہے نہ ''سفارشی'' جو انہیں اس کے تباہ کن نتائج سے بچا سکے۔ انہیں اس طرح سمجھانے سے مقصد یہ ہے کہ یہ زندگی کے خطرات سے اپنی حفاظت کرلیں اور سورۃ المومنون میں بعینہٖ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ انہیں وارننگ دے دیں انذرھم یوم الازفۃ اذالقلوب لدی الحناجر کظمین مالظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع (۴۰/۱۸)۔ اے رسول! تو ان لوگوں کو وحی کے ذریعے ان کے اعمال کے ظہور نتائج کے وقت سے آگاہ کرتا رہ جو زیادہ دور نہیں۔ اس دن نتائج کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ ان کے دل اچھل کر حلق تک آ جائیں گے اور باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہوں گے۔ ان کی جان پر بنی ہوئی ہوگی۔ اس وقت ان ظالمین کا کوئی دوست اور غمخوار نہیں ہوگا۔ نہ کوئی ایسا رفیق و یار جس کی ''سفارش'' مانی جا سکے۔ ان دونوں آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی کی سفارش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ رسول کریم ﷺ نے تو اپنی بیٹیؓ اور پھوپھیؓ سے فرما دیا تھا کہ خدا کے ہاں کے لئے

کچھ کرلو میں وہاں تمہارے کام نہیں آ سکوں گا۔ (ان کے مقابلہ میں ہم مجرمین' ظالمین اور مشرک مسلمین شے' ہی کیا ہیں؟)۔ اس لئے روایات کی رو سے نبی کریم ﷺ کی طرف سے شفاعت (سفارش) کرنے کا عقیدہ خلافِ قرآن ہے۔ اس آیت میں ظالمین کہا گیا ہے۔ ظالم کون لوگ ہوتے ہیں؟ سورۃ المائدہ میں ہے کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظلمون (۵/۴۵)۔ جولوگ ماانزل اللہ (قرآن) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے (فیصلے کرنا حکومت کا کام ہوتا ہے) لہٰذا اس آیت کا مطلب ہوا جو لوگ قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی تو ظالم ہیں (ہم مسلمانوں کی حالت)۔ مجرم وہ ہے جو دوسرے کے باغ کا پھل توڑ کر اپنے گھر لے آئے یعنی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو Exploit کر کے ہتھیا لے۔ اور غیر اللہ کی محکومیت و اطاعت سے زندگی بسر کرنے والے مشرک ہوتے ہیں لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی اپنے اندر جرأت نہیں رکھتے اس لئے دیگر اقوام کی طرح جہنمی زندگی بسر کئے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ذمہ دار ہم ہیں اور وارث کتاب اللہ ہوتے ہوئے اس سے عملاً اعراض اور دین کے راستے میں رکاوٹ کی بنا پر اس دنیا کے طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہیں اور آخرت کا عذاب اس سے بڑا شدید ہوگا۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ انا کل شیء خلقنہ بقدر (۵۴/۴۹)۔ ہم نے ہر شے کے لئے اندازہ' پیمانہ' قانون مقرر کر رکھا ہے (تمام کائنات کا نظم ونسق اسی کے قوانین کے مطابق سرانجام پا رہا ہے)۔ ومن کل شیء خلقنا زوجین (۵۱/۴۹)۔ ہم نے ہر شے کے ساتھ' دوسری شے اس طرح پیدا کی ہے کہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث بنتی ہیں۔ ما من شفیع الا من بعد اذنہ (۱۰/۳)۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ایک شے دوسری شے کے ساتھ مل کر ایک نیا نتیجہ پیدا کرتی ہے اگر یہ چیزیں اس کے قانون کے مطابق آپس میں نہ ملیں تو وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ (اسی طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی تائید وحمایت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو اس کی یہ تائید وحمایت اسی صورت میں بہتر نتائج پیدا کرسکتی ہے جب وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو)۔ من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منھا ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا (۴/۸۵)۔ اگر کوئی شخص (خدا کے اس) نظام حسنہ کے قیام و استحکام کے لئے تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے گا تو اسے بھی اس کے خوشگوار نتائج سے حصہ مل جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص فریقِ مخالف کا ساتھ دے گا اور غلط نظام کی تائید میں کوشش کرے گا تو اس کے تباہ کن عواقب میں وہ بھی شریک ہوگا۔

معزز قارئین غور کیجئے! ان چار چھوٹی چھوٹی آیات میں دیئے گئے اصول وقوانین کی بنیادوں پر سائنس کی ساری عمارت کھڑی ہے' اور انہی پر غور کرنے سے شفاعت کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس روایات کو سینوں سے لگانے والے حضرات کو نہیں معلوم کہ اگر آکسیجن گیس اور ہائیڈروجن گیس کی آپس میں شفاعت نہ ہوتی تو پانی نہ ہوتا اور پانی نہ ہوتا تو روئے زمین پر زندگی نہ ہوتی۔ دیگر بے شمار اشیاء کے علاوہ اگر ایک باریک سی تار کی دوسری تار سے شفاعت نہ ہو تو انہیں حکایات اور اپنی معلومات کا اعلان کرنے کے لئے لاؤڈ سپیکر کی آواز کی سہولت بھی میسر نہ ہو۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے۔ من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ (۲/۲۵۵)۔ ''وہ کون ہے جو اس کے پاس اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔'' اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ہے اور حضورﷺ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کریں گے۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانونِ مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآن کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے۔ لہٰذا اگر قانونِ مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن میں موجود ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دیئے گئے ہیں۔ مثلاً اس سے پہلی آیت یہ ہے ''اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے (ربوبیت عامہ کے لئے) کھلا رکھو۔ قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ (۲/۲۵۴)۔ جس میں نہ گناہوں کی قیمت ادا کر کے جنت خریدی جا سکے گی۔ نہ کسی بزرگ کی دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی شفاعت۔۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے۔ من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ (۲/۲۵۵)۔ اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائے گی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائے گا اور قرآن میں تضاد نہیں ہے (۴/۸۲)۔

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟۔ قانون مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کے لئے تشبیہاً ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ' ملزم ہوتا ہے۔ مستغیث ہوتا ہے۔ گواہ ہوتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہوگا وہ عدالت کی کٹہرے میں اکیلا کھڑا ہوگا۔ ولقد جئتمونا فرادی... وما نری معکم شفعاء کم ... (۶/۹۵)۔ تم ہمارے حضور تنہا پیش ہو گے۔۔۔ تمہارے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہوگا' اور پولیس کا سپاہی'' تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے لائے گا۔ وجاء ت کل نفس معہا سائق .... (۵۰/۲۱)۔ ''ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہو گا'' اس کے علاوہ گواہ بھی ہوں گے۔۔۔ وشھید (۵۰/۲۱)۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آ جائے گا اور اسے (حاکم کی طرف سے) گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ ہیں وہ شفیع (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ (۲/۲۵۵)۔ وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔'' یہ گواہ رسول بھی ہوں گے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے۔ یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اجبتم (۵/۱۰۹)۔ جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی اس طرح بلائی جائیں گی۔ یوم یقوم الروح والملئکۃ صفا لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمن وقال صوابا (۷۸/۳۸)۔ جس دن ''الروح اور ملائکہ'' صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے''۔ لہٰذا ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دے دینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت خود قرآن کریم نے کر دی جہاں فرمایا۔ ولا یملک الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ الا من شھد بالحق وھم یعلمون (۴۳/۸۶)۔ جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے اور وہ بات کو جانتا ہے۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اسی التباس کے رفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کہا ہے (۱۶/۸۹)۔ شفیع کہیں نہیں کہا۔۔۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ:

(۱) اس دنیا میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جانا۔ اگر وہ کام اچھا ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو

بھی اس کا اچھا اجر ملے گا۔ اگر وہ کام برا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصہ پائے گا۔

(۲) آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ یہ تمثیلی بیان ہے۔

(۳) مجرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا' یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حق دار نہیں' قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ جنت فقط اعمال کے بدلے سے ملتی ہے تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون (۷/۴۳)۔ سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم رہ کر کرپٹ ہو جاتی ہے۔

حفاظتی تدبیر بتانے والا کون تھا؟

یہ بات بڑی نازک بھی ہے' حیران کن اور تاسف انگیز بھی۔ افسوس ناک اس لئے کہ اس سے ناموسِ رسالت مآب ﷺ اور ذاتِ اقدس کی علمی فضیلت پر طعن آتا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ نازک اس لئے کہ اس کا تعلق مسلمانوں کی اکثریت کے عقیدہ اور جذبات سے ہے عقل سے نہیں۔

صحیح بخاری میں شفاعت کے عقیدہ کو پختہ تر کرنے کے لئے ایک اور سکیم بھی درج کی گئی اور وہ یہ کہ سورہ البقرۃ کی آیت ۲۵۵ جس کے جزو من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ کو شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے ''آیت الکرسی'' کا نام دیا گیا۔ اس کے فضائل' اوصاف اور فوائد پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں تاکہ اسے بزعمِ خویش حفاظتی الارم تصور کر کے صبح و شام رات گئے اتنا دہرایا جائے کہ شفاعت کا عقیدہ قوم کے دل و دماغ اور تحت الشعور میں رچ بس جائے۔ حالانکہ اس آیت کریمہ میں سورۃ الحشر کی آخری تین آیات کی طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے شمار صفات میں سے چند صفات یکجا بیان کی گئی ہیں۔ اسی سورۃ کی آخری دو آیات میں مومنین کو دعاء سکھائی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے انہی دو آیات کی رات کو تلاوت تجویز فرمائی تھی۔ ظاہر ہے مقصد اس سے صرف دعاء ہی تھا۔ آپ ﷺ نے ان کے فضائل و فوائد نہیں گنوائے تھے تاکہ قرآن کو جنتر منتر کی کتاب نہ سمجھ لیا جائے۔ لیکن ہم نے اس کے برعکس روایات کو ایمان کا درجہ دے کر ان کی رو سے جن بے شمار ذرائع سے ہر قسم کے خطرات سے حفاظت کے لئے سورۃ البقرۃ کی آیت کریمہ ۲۵۵ (آیت الکرسی) کو جنتر منتر کی چیز بنا رکھا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ سب کچھ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق نہیں ہو رہا۔

صحیح بخاری جلد ۴ حدیث نمبر ۴۹۵ میں ابوسعید

الخدریؓ سے روایت ہے کہ جب تم نماز پڑھ رہے ہو اور کسی کا ارادہ (مقصد) تمہارے سامنے سے گزرنے کا ہو تو اسے روکو۔ اگر وہ اصرار کرے تو پھر روکو اور اگر وہ پھر بھی اصرار کرے تو اس کے ساتھ شدت سے لڑو اور اسے دھکا دے کر پیچھے کی طرف دھکیل دو۔ کیونکہ ایسا شخص شیطان کی مانند ہے۔ (اسی حدیث میں آگے) ابو ہریرہؓ سے مروی شیطان اور ان کے آپس میں آیت الکرسی والی کہانی بالکل انہی الفاظ میں درج ہے جسے اگلی حدیث میں قارئین کے غور و فکر کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

صحیح بخاری جلد ۶ حدیث نمبر ۵۳۰ میں ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص رات کو سورہ البقرہ کی آخری دو آیات کی تلاوت کر لے تو اس کے لئے کافی ہوگا۔ (اس سو فیصد صحیح حدیث کے آگے نئے پیراگراف میں لکھا ہے کہ:

''ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رمضان کی زکوٰۃ (فطرانہ) کی حفاظت کا حکم فرمایا۔ ایک شخص میرے پاس آیا اسنے کھانے کے سامان میں سے چرانا شروع کر دیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ (پھر ابو ہریرہؓ نے ساری کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں دوسری جگہ ہے کہ وہ شخص تین راتیں لگا تار آتا رہا) اس شخص نے مجھ سے کہا کہ برائے مہربانی مجھے رسول اللہؐ کے پاس نہ لے جائیں میں تمہیں چند الفاظ بتاتا ہوں جن سے اللہ تمہیں فائدہ دے گا۔ جب تم اپنے بستر پہ جاؤ تو آیت الکرسی اللہ لا الٰہ الا ھوا لحی القیوم سے آخر تک سورہ البقرہ کی آیت ۲۵۵ (بحوالہ بخاری جلد ۳ حدیث نمبر ۵۰۵ بی) پڑھا کرو اس سے ایک محافظ اللہ کی طرف سے تمہاری حفاظت کرے گا اور صبح تک شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ ابو ہریرہؓ سے یہ کہانی سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو رات کو تمہارے پاس آیا تھا اس نے تمہیں سچ بتایا اگرچہ وہ جھوٹا ہے اور وہ شیطان تھا۔''

معزز قارئین! اس روایت سے یہ سازش کی گئی کہ جس ذات اقدس و اعظم ﷺ پر قرآن نازل ہوا انہیں اس آیت کے ''باطنی'' معانی معلوم ہی نہیں تھے۔ (محولہ بالا روایت میں ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب پہلی رات میں نے اس شخص کو چوری کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے پکڑ کر کہا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا تو اس نے کہا ہم غریب لوگ ہیں کنبہ بڑا ہے کھانے پینے کی تنگی ہے تو مجھے اس پر رحم آیا اور اسے چھوڑ دیا۔ صبح کو جب میں نے یہ کہانی رسول اللہ ﷺ کو سنائی تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ آج رات پھر آئے گا۔ ایسا ہی ہوا وہ اگلی رات پھر آیا اور اس نے مال چرانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے پکڑا اس نے پھر ویسے ہی کہا۔ مجھے پھر اس پر رحم آیا اور چھوڑ دیا۔ اگلی صبح حضور ﷺ کو کہانی سنائی تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ آج رات پھر آئے گا۔ وہ تیسری رات پھر آیا۔ اس نے وہی

حرکت کی۔ میں نے اسے پکڑا اور کہا کہ اب کے میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور ضرور حضورﷺ کے پاس لے جاؤں گا تو پھر اس نے مجھے آیت الکرسی میں پوشیدہ راز بتایا۔ تیسری صبح جب میں نے حضورﷺ کو یہ کہانی سنائی تب آپﷺ نے فرمایا کہ اس نے تمہیں سچ بتایا مگر وہ جھوٹا چور شیطان تھا۔

برادرانِ محترم! اس روایت سے مذہب کو ذریعہ معاش بنانے والے حضرات کو حضورﷺ کے علم غیب کی بھی سند مل گئی۔ منصف پیمانے لے کر بیٹھ گئے۔ بحثیں ہونے لگیں کہ حضورﷺ کو غیب کا علم تھا یا نہیں اور اگر تھا تو کتنا؟۔ صدیوں سے اس مسئلہ پر سر پھٹول جاری ہے۔ ہے نا حیران کر دینے والی سازشیں؟۔ قرآن میں ہے کہ مومنین کو خائف کرنے کے لئے شیطان خفیہ سازشیں کراتا رہتا ہے (۵۸/۱۰)۔ لہٰذا اے جماعتِ مومنین! امن وسلامتی کے ضامن قرآنی نظام میں پورے پورے طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقوشِ قدم کا اتباع نہ کرنا۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (۲/۲۰۸)۔ تو ہم پرستی شیطانی عمل ہے اور شیطان کے سب وعدے فریب ہوتے ہیں۔ (القرآن ۲۰۔۱۱۹/۴)۔ (۶۴/۱۷)۔ مذہبی پیشوائیت لوگوں کو توہم پرستی میں مبتلا رکھتی ہے تاکہ اس طرح اپنے مفاد حاصل کرے۔ یہ شیطانی عمل ہے (۱۲۰۔۱۱۷/۴)۔ وزین لھم الشیطن اعمالھم فصدھم عن السبیل فھم لا یھتدون۔ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں اس قدر خوشنما بنا رکھا ہے کہ وہ اپنے مسلک کو بالکل صحیح اور درست سمجھتے ہیں اس نے انہیں صحیح روشِ زندگی کی طرف آنے سے ایسے روک رکھا ہے کہ وہ اس کی طرف راہنمائی نہیں حاصل کر پاتے (۲۴/۲۷)۔ ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض لہ شیطنا فھو لہ قرین۔ وانھم لیصدونھم عن السبیل و یحسبون انھم مھتدون۔ جونہی کسی نے نظامِ ربوبیت کے تصور سے منہ موڑا اسی جیسے اور شیطان صفت لوگ جھٹ سے اس کے ساتھ آ ملے اور اس پر بری طرح سے مسلط ہو گئے۔ یہ ساتھی ایسے لوگوں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (اور فریب انگزیوں کا ایسا جال بچھاتے ہیں کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ سیدھے راستے سے ہٹ چکے ہیں) وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح شیطان نے مسلمانوں کو قرآن سے غافل کر دیا اور یہ اس سے یوں باہر نکل گئے جس طرح سانپ اپنی کینچلی چھوڑ کر صاف باہر نکل جاتا ہے کہ اس کا نشان تک اس کے جسم پر باقی نہیں رہتا (۱۷۵/۷)۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی قومی عملی زندگی اس کی زندہ شہادت ہے۔ وہ ایسے کہ دنیا کے تمام مسلم ممالک میں سے کوئی ایک بھی اسلامی ملک نہیں، جہاں رسول اللہﷺ کے اتباع میں خلفائے راشدینؓ کے طرزِ حکومت کی مانند قرآنی نظامِ حکومت قائم ہو، ہماری ذلت اور رسوائی کی وجہ بھی یہی ہے۔ مفکرِ قرآن علامہ اقبالؒ نے سچ فرمایا تھا کہ

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی''

(دومرتبہ طلاق کے بعد) فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره (۲/۲۳۰)۔

''پھر اگر طلاق دے دی مرد نے بیوی کو (تیسری بار) تو نہیں حلال ہوگی وہ اس کے لئے اس کے بعد جب تک کہ نہ نکاح کرے وہ کسی اور مرد سے اس کے سوا''۔ (ترجمہ شبیر احمد شاہ)

ہمارے ہاں اس کو حلالہ کے پرفریب جال میں ڈال دیا گیا تھا۔ اب اہل مغرب بھی طلاق کا یہی تصور اپنا رہے ہیں۔

''کبھی ساتھ نہ چھوڑیں گے'' برطانوی جوڑے کی ۳۸ برس میں تیسری مرتبہ شادی۔

لنکا شائر (اے پی پی) انگلینڈ کے شہر لنکا شائر میں ایک جوڑے نے آپس میں دومرتبہ طلاق کے بعد تیسری مرتبہ شادی کر لی تاہم اس بار عہد کیا ہے وہ مرتے دم تک ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے جین اور برٹ کے درمیان ۳۸ سال قبل ملاقات ہوئی اور ایک دوسرے کے اسیر ہو گئے شادی کے چار سال بعد ۱۹۸۵ء میں ان کے درمیان پہلی طلاق ہوئی تاہم ان کو بعد میں احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے بدستور محبت کرتے ہیں لہٰذا ان کو دوبارہ شادی کر لینی چاہئے۔ جوڑے میں چھ سال بعد کسی بات پر جھگڑے کے بعد دوبارہ طلاق ہوئی لیکن اب بلیک برن کاؤنٹی کے رہائشی جوڑے نے چرچ میں جا کر تیسری مرتبہ شادی کی ہے کیونکہ ان کے بقول ان کی دوسری طلاق ایک غلطی تھی برٹ کا کہنا ہے کہ جین ہمیشہ کہتی تھی کہ تمہارا پاؤں قبر میں بھی ہو تو شادی تم سے ہی کروں گی اور اس وقت یہ شادی نہایت مناسب ہے کیونکہ دو دفعہ دل کے بائی پاس کرانے کے بعد قبر کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ (الاخبار اسلام آباد ۲۰۰۷/۸/۸)

☆ ہمارے ہاں زیتون کی کاشت کی اشد ضرورت ہے شکر ہے کہ اسلام آباد بھی اس کے لئے حرکت میں آیا۔

رواں شجر کاری مہم کے دوران ۲ لاکھ پودے لگائے جائیں گے، چیف کمشنر اسلام آباد

اسلام آباد (آئی این پی) چیف کمشنر اسلام آباد خالد پرویز نے کہا ہے کہ وفاقی دارالحکومت کے دیہی علاقوں میں مون سون شجر کاری کی رواں مہم کے دوران زیتون کی کاشت سمیت مختلف اقسام کے دو لاکھ پودے لگائے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بات منگل کے روز موضع تمیر میں شجر کاری مہم کے افتتاح کے بعد بات چیت کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے بتایا کہ ان پودوں کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے کمیونٹی اور محکمہ زراعت کا عملہ فعال کردار ادا کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آباد کے دیہی علاقوں میں زیتون کی کاشت کے لئے خصوصی توجہ دی جائے گی۔ قبل ازیں افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈائریکٹر فنانس ڈویلپمنٹ اسلام آباد کیپٹل ٹیریٹری امتیاز احمد نے بتایا کہ مون سون شجر کاری کی رواں مہم کو کامیاب بنانے کے لئے کاشتکار بھی اس میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ (الاخبار اسلام آباد ۲۰۰۷ء/۸/۸)

☆ باغبان خواتین وحضرات سے استدعا ہے کہ وہ زیتون کی کاشت اور پیوندکاری کی مہم کو کامیاب بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں اور اپنے غیر رسمی اجتماعات ۱۵۔۳۰ تاریخ کو اس کے لئے مشاورت اور تعاون کی نئی مثال قائم کریں۔

پتہ رابطہ: **(1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیومری۔ (2) صبینہ یاسمین، سینئر نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم۔ (3) محمد افضل ولد عبدالحمید، چک نمبر 215 (تاحیات ممبر)، باغبان ایسوسی ایشن، بورے والا، وہاڑی۔**

INTRODUCTION

By
Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

For a long time, it has been fashionable in the West to assert that religion is a private matter between an individual and his God. Religion should, therefore, not be allowed to interfere in every day matters of individual and collective life. Understandably, as a logical conclusion of this argument, the Bible has had nothing to do either with the constitution making process or with matters of routine legislation in Western parliaments. In contrast to this, Muslims have always been proclaiming that in an Islamic state, Islam has a central role to play both in the evolution of a constitution as well as routine legislation to regulate individual and collective lives of people. In the recent past, most of the Muslim countries were under foreign rule and their legislation was taken care of by their foreign rulers. However especially, since the end of the Second World War, a very large number of Muslim countries have become independent sovereign states. From then on they had to evolve their own constitutions and routine laws. It was no longer a matter of just academic discussion whether or not Islam governed daily life of its followers. The newly independent Muslim countries had to demonstrate that it was in fact so. One of such countries, Pakistan in fact, claimed its separation from India arguing, amongst other reasons, that as Muslims in United India would not be allowed to order their lives under the dictates of Islam, they are entitled to a separate independent state. Since, her inception Pakistan clearly stated that no laws would be enacted in the country repugnant to Islam.

This was easier said than done. Islam had to be clearly defined. It was necessary to agree on sources of Islamic value systems and laws. Muslim scholars had differed on basic issues. This did not matter much while countries were being ruled by imperial powers. Law making was the jurisdiction of the rulers. The laws made by the imperial powers were clearly recorded, well understood and the law making process was clearly defined. With the advent of independence, Islam now had to undertake this task. Who defines a value system in an Islamic Society? What is the procedure for law making? Is it the job of elected representatives or Muslim religious scholars? Who interprets the Quran? Who is the final

authority on Quranic injunctions? Which book of Tradition (Hadith) or Islamic Jurisprudence is to be accepted as completely authentic and hence to be followed without question by the contemporary lawmakers? How much freedom the modern legislators should have, to abandon or amend the jurisprudence enacted in the past? Unless, satisfactory answers to such questions are forthcoming, there would be many problems in developing a logical and agreed upon legislation. If legislation is to remain within the boundaries of a higher value system i.e. حدود الله "Limits set by God"

تلك حدود الله فلا تقربوها

"These are limits set by Allah, approach not nigh." (2/187)

then such a value system had to be compiled and precisely stated. This would enable the legislators, if they were allowed; to make laws remaining within the boundaries lay down by God. It would also enable the public to keep a check on the legislators that such boundaries are being respected.

Before we go into the details of " Limits of Allah", it would be relevant to discuss whether or not Allah should be involved in formulation of a value system. Muslims all over the world generally believe that Islam is not only a religion in the traditional sense dealing exclusively with man's relation with his God but is also a way of life which offers significant guidance to its followers as to how they should order their individual and collective lives. Many Western scholars wonder as to why humanity can not make laws for itself. It can think for itself. Laws, they argue, must change with time and space. Would it be advisable to bind ourselves within the externally given permanent law and value system which we would not have the authority to change as required in changing circumstances. Islam has definite and precise views on this subject. It proposes that humanity would be well advised in its own interest to voluntarily bind itself within an externally given permanent value system. Remaining with these bounds, the "Limits of Allah", mankind must keep on making fresh laws, in consultation among themselves, as required by changing times. This mix of permanence and change would bring about a unity of thought in mankind and lead to harmonious universal growth,. It would be of interest to briefly examine the rationale offered by Islam in support to this theory.

As part of a grand design, God created this universe over a long period of time in six stages.

ان ربكم الله الذي خلق السماوات والارض في ستة ايام ثم استوى على العرش.....

> "Surly your Rabb is Allah, who created the heavens and the earth in six periods and then established His firm control over them." 7/54

(In what periods and over how long a time is not the subject matter of this discussion).

The creation took place in a planned, harmonious and orderly fashion because the forces of nature (Angels) or in Arabic "ملائكه" (Malaika) were obeying divine orders without question.

يخافون ربهم من فوقهم ويفعلون مايؤمرون

> "They fear their Rabb (God) above them and do what they are commanded." 16/50

As a part of this grand design, God created man, gave him a faculty to think for himself and a choice to live by his own will. To help him to evolve a universally prosperous and peaceful society 'جنة' (Paradise), God offered a value system that humans could accept or reject at their discretion. The universe would go on evolving according to the laws of nature because the forces of nature (Angels) would continue to function according to immutable laws. This evolution would be peaceful if man also lived in accordance with divinely offered and universally applicable permanent value system. But if he chose to live by defying God's laws he would face trouble. The Quran, in many places, draws the attention of mankind to natural phenomena, pointing out how progress and evaluation is so harmonious because there is submission to divine laws by the forces of nature. Similarly, the Quran argues, there would be an orderly and peaceful evolution of human civilization, if humans chose to voluntarily live by God's laws. Such laws have proved their efficacy by ensuring a peaceful evolution and administration of the physical universe. It is granted that by a process of trial and error and over a long period of time, humans would discover efficient value systems for managing their own affairs.

يايها الانسان انك كادح الى ربك كدحا فملاقيه

> "O man, it is possible for you after a long period of hard and painful living to comprehend the ways of your Rabb." 84/6

But it would economise human effort if he chose to live by a proven value system and in the process, he would avoid bloodshed and wasted effort. A question arises that if the problem is that simple, why would man be tempted to defy God's laws. The reason is that God's laws have been designed to promote a universal, peaceful and prosperous society, no matter how long it takes and how much hard work humans have to undertake. God persuades fast runners to help the slow runners so that entire humanity keeps in step. Man, on the other hand, is tempted to cut corners. More often than not he thinks in selfish or narrow family, tribal or national interests rather than the interests of entire humanity. He is in a hurry.

ويدع الانسان بالشر دعاءه بالخير وكان الانسان عجولا

> "And often times man resorts to destructive rather that constructive action because he often desires quick returns." 17/11

And does not care to help the slow runners to catch up with him.

In fact too frequently, he would not mind deliberately slowing the progress of a part of human beings so that his own progress can be faster. Such a negative course of action would impede progress, occasionally stopping it altogether. In his grand design, God has created this universe for a positive purpose. It will get better in time.

واشرقت الارض بنور ربها ووضع الكتاب وجئ بالنبيين والشهداء وقضي بينهم بالحق وهم لايظلمون

"And the earth will beam with the light of its Rabb…" 39/69

God exhorts mankind to help in this process by living within a universally accepted and applicable, albeit divinely given, value system. It would be in mankind's own interest.

As this was of such vital importance to humanity, God took upon himself the duty of conveying His suggested value system to humankind. Ever since the dawn of civilization, He has been doing so through His messengers. Prophets with God's message have been conveying His value system at all times to all people. Man's progress towards peace and plenty would have been smoother and faster if a class of people had not chosen to oppose such prophets for their own selfish good. In spite of

such opposition, the world has progressed, albeit slowly, and humanity has become wiser and a bit more mature, living though turbulent times and learning by experience., A quantitative change came about when God, is His wisdom, decided that humanity had matured to such a state that it no longer needed to be led by the hand every now and then. A permanent value system, applicable for all times to all peoples in the universe was handed out to humanity through the last of Prophets – Muhammad of Arabia. God promised that though He could, if He so wanted, He would not amend, replace or vary these sets of values whatever the circumstances. A tribute was thus paid to the good sense of humanity by being told that they were on their own. The fact that the rules of the game were never going to be changed was a great blessing for those who would decide to play the game of life according to them because they could plan their actions in an atmosphere of trust.

God's message to the people was conveyed in all corners of the civilized world but it had simultaneously to be demonstrated that the course of action recommended in these messages was practical. It produced the results it promised. So, as a part of their mission, the Prophets did their best to set up a society based on the value systems as received by them. In the light of this broad value system, the prophets in consultation with people in their times and space, made detailed laws for their times. In the same tradition, the last of the prophets, Prophet Muhammad (pbuh), was asked to consult his people while formulating detailed laws, remaining within the limits of Allah's as specified in the Quran.

..... وشاورهم في الامر.....

> "And consult your people in the management of state affairs." 3/159

History is witness to the fact that Prophet Muhammad (pbuh) set up a very good society in his times and the Quran exhorts its readers to model their individual and collective lives on the pattern set by the Prophet.

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة.....

> "In the person of the prophet of God, there is for you a very good pattern to base your lives on." 33/21

So, in accordance with the precedence set by Prophet Muhammad (pbuh), Muslims all over the world were to :-

a) Adopt the broad value system as set out in the Quran.

b) Make detailed laws to suit their times and their countries, remaining within the bounds lay down by the Quran.

c) And such laws were to be made in consultation among themselves.

Where independent Muslim states got bogged down in their process of legislation was the misunderstanding that detailed laws as adopted by Prophet Muhammad (pbuh) or his successors for their times and space, were also to be adopted in modern times. It is not fair to Prophet Muhammad (pbuh) to impose upon him the function of legislation for our times, a mission not suggested by God. To make a value system for all times and spaces is exclusively in the domain of God.

ان الحكم الا لله امر الا تعبدوا الا اياه.....

> "Sovereignty belongs to God alone. He has ordained that you unquestionably obey only Him." 12/40

It is not fair to ask a human being to legislate for people living hundred of years later if for no other reason than the fact that no mutual consultation can take place.

Prophet Muhammad made some excellent laws for his times. His outstanding success is a witness to this fact. Later Muslim administrators اولی الامر (those charged with administering) must get down to making laws for their times and spaces. This would be in the best tradition of Prophet Mohammad. If this premise was to be accepted, law making for Muslim countries would become a simplest process. It would be necessary to list Quranic value systems in all aspects of individual and collective life and in all fields of activity such as social, economic, political etc. These broad value systems, "Limits of Allah", would have to be kept in view at all times when elected parliaments in Muslim countries get down to evolving a constitution or routine legislation for themselves,. Such a constitution or routine legislation, which does not transgress ' the limits of Allah" would be call Islamic . It is as simple as that. In this connection, the Quran stands out as of vital and cardinal importance. It would be profitable, therefore, to briefly discuss the Quran as source of a permanent value system before we list the values as such.

****